اہلِ علم کا سلیقۂ اختلاف

ڈاکٹر عبدالحی ابڑو

شریعہ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی۔ اسلام آباد

297.4
ط 39 ا
14226

Marfat.com

اہلِ علم کا سلیقۂ اختلاف

ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی

ترجمہ و تخریج

ڈاکٹر عبدالحی ابڑو

شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی۔ اسلام آباد

Marfat.com

297.4
9 ...
۱۳۳۳۶۳

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب: اہل علم کا سلیقۂ اختلاف

افادات: ڈاکٹر طٰہٰ جابر فیاض العلوانی

ترجمہ و تخریج: ڈاکٹر عبدالحی ابڑو

اشاعتِ اول: ۲۰۱۵ء

ناشر

شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی۔ اسلام آباد

SHARI'AH ACADEMY
International Islamic University, Faisal Masjid Campus
Islamabad Tel: +92 051 9261761 ext. 289
Email: sapublication@gmail.com

مطبع: ادارہ تحقیقاتِ اسلامی پریس۔ اسلام آباد

کمپوزنگ: محمد آصف قریشی

Marfat.com

فہرست

پیشِ گفتار	۷
فصل اول: اختلاف اور متعلقہ اصطلاحات کی تعریف	۱۵
مذموم اور مستحسن اختلاف	۱۸
مستحسن اختلاف کے چند فوائد	۱۸
اختلاف میں نفس پرستی کی جانچ	۲۱
اختلاف کے بارے میں علما کی راے	۲۴
فصل دوم: اختلاف کی تاریخ	۲۷
عہد نبویؐ میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف	۲۷
تاویل اور اس کی قسمیں	۳۰
تاویل کے قواعد وضوابط	۳۳
اہلِ اجتہاد صحابہ کرامؓ	۳۸
اختلاف برائے اختلاف سے پرہیز	۴۱
عہد نبویؐ میں آدابِ اختلاف کے چند نقوش	۴۵
عہدِ صحابہؓ میں اختلاف اور اس کے آداب	۴۶
خلافت راشدہ میں ادب اختلاف کے چند نقوش	۵۶
اختلافِ راے کی مزید مثالیں	۵۹
خلافتِ راشدہ میں ادبِ اختلاف کے نمایاں خدوخال	۶۵

Marfat.com

عہدِ تابعین میں ادبِ اختلاف	۶۶
اعتقادی اور فقہی اختلافات پر سیاسی اختلاف کے اثرات	۷۱
امام ابو حنیفہ اپنے شیخ امام جعفر صادق کے حضور میں	۷۷
خوارج سے حضرت ابن عباس کا مناظرہ	۷۹
فصل سوم: استنباطِ احکام میں مناہجِ ائمہ کا اختلاف	۸۳
فقہی مسالک	۸۳
مشہور ائمہ کے مناہجِ اجتہاد	۸۴
علمی اختلافات میں اہلِ علم کا طرزِ عمل	۹۶
اختلافی مسائل میں نکیر کا اصول	۱۰۵
فصل چہارم: اسبابِ اختلاف کا ارتقا	۱۱۵
اسبابِ اختلاف: عہدِ رسالت سے عہد صحابہ تک	۱۱۵
عہدِ فقہا میں اسبابِ اختلاف	۱۱۸
فصل پنجم: ائمۂ مجتہدین کے سلیقۂ اختلاف کے چند نقوش	۱۲۷
اختلافی مسائل کی چند مثالیں	۱۲۸
امام مالک کے نام لیث بن سعد کا مکتوب	۱۳۱
فقہا کے آدابِ اختلاف کے چند نقوش	۱۳۵
امام ابو حنیفہ اور امام مالک	۱۳۶
امام محمد اور امام مالک	۱۳۶
امام شافعی اور امام محمد	۱۳۷

Marfat.com

امام مالک اور امام ابن عیینہ	۱۴۰
امام مالک اور امام شافعی	۱۴۱
امام احمد بن حنبل اور امام مالک	۱۴۱
امام ابو حنیفہ کے بارے میں اہل علم کی توصیفی آرا	۱۴۲
امام شافعی کے بارے میں اہل علم کی توصیفی آرا	۱۴۵
امام احمد اور امام شافعی	۱۴۶
فصل ششم: قرونِ خیر کے بعد اختلاف اور اس کے آداب	۱۵۱
چوتھی صدی ہجری کے بعد حالات کا رخ	۱۵۳
تقلید اور اس کے اثرات و نتائج	۱۶۱
ماضیِ قریب میں مسلمانوں کا طرزِ فکر و عمل	۱۶۴
عہدِ حاضر میں اسبابِ اختلاف	۱۶۹
راہ نجات	۱۷۴
خاتمہ	۱۷۹

Marfat.com

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیشِ گفتار

اس حقیقیت سے انکار ممکن نہیں کہ اختلاف، فرق و تفاوت اور رنگا رنگی انسان کا خمیر اور انسانی سماج کا خاصہ ہے۔ ہر انسان اپنی تخلیق، غور و فکر اور ذوق و مزاج کے اعتبار سے اپنی جداگانہ شخصیت اور انفرادیت رکھتا ہے۔ انسانی سماج میں پایا جانے والا تنوع اسی انفرادیت کا نتیجہ ہے اور یہ منشاے الٰہی کے مطابق ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ﴾ [ھود۱۱: ۱۱۸] (کہ اگر تمہارا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی جماعت بنا دیتا، لیکن نہیں، وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے)۔

دوسری طرف انفرادی خصوصیات میں فرق اور اختلاف کے باوجود اجتماعی اور قومی امور میں ایک خاص حد تک اتحاد و یگانگت بھی مطلوب ہے۔ اختلافِ فکر و نظر کو کسی صورت میں فتنہ و فساد اور ملی وحدت کے نقصان کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ فکری اختلاف کا اس حد تک بڑھ جانا کہ اس کی وجہ سے معاشرہ گروہ بندی کا شکار ہو جائے اور آپس کی الفت و محبت جاتی رہے، اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ قرآن کریم تنبیہ کرتا ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ﴾ [الانعام۶: ۱۵۹] (جن لوگوں نے اپنے دین میں الگ الگ راستے نکالے اور کئی گروہوں میں تقسیم ہو گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں)۔ گویا معاشرتی توڑ پھوڑ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس میں ملوث لوگ نسبتِ مصطفوی ﷺ سے بھی محروم ہو سکتے ہیں۔

Marfat.com

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ علم و معرفت میں پیش قدمی اور اضافے کی وجہ سے کسی کا نقطۂ نظر بعض امور میں کئی لوگوں سے مختلف اور اچھوتا ہو سکتا ہے اور اسے معاشرے کے ایک بڑے طبقے میں پذیرائی اور قبولیت بھی حاصل ہو سکتی ہے، لیکن خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے، جب اپنی رائے کو قطعیت کا درجہ دے کر منوانے اور دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ گزشتہ چند صدیوں سے مسلم سماج کے بعض انفرادیت پسند لوگ مذکورہ رویے کا شکار ہو گئے ہیں؛ جس کا نتیجہ معاشرتی ٹوٹ پھوٹ، باہمی جنگ و جدل، محاذ آرائی حتیٰ کہ ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ حالانکہ بہت سے امور میں سلف صالحین کے درمیان بھی اختلاف رہا اور اس کی نوعیت بھی کچھ معمولی نہیں تھی، بہت سے مسائل میں حلال و حرام تک کا اختلاف تھا؛ لیکن تفریق اور انتشار کا وہ ماحول، جس کا ہم شکار ہیں، سلف کے ہاں اس کا شائبہ تک نہ تھا۔ تمام تر اختلافی آرا کے باوجود ان کے ہاں ایک دوسرے کے احترام میں کبھی فرق نہیں آیا اور باہمی خیر خواہی کے جذبات کبھی ماند نہ پڑنے پائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے اختیار کردہ موقف پر دلائل کی رُو سے ذاتی طور پر مطمئن ہونے کے باوجود دوسرے اہل علم کی رائے کو بھی قابل قدر سمجھتے تھے۔ معاصرانہ کشاکش کے باوجود ان کے قلوب کینے اور بغض و عناد جیسے باطنی امراض سے پاک تھے۔ ایک امام کے شاگرد اپنے استاد کے معاصر ائمہ کی شاگردی اختیار کرنے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے تھے۔

اختلاف اور مخالفت کا واضح فرق، جسے سمجھنے کے لیے کسی افلاطونی عقل کی ضرورت نہیں، بصد افسوس ہمارے اہل دانش کی نگاہوں اور رویوں سے اوجھل ہے۔

Marfat.com

ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی نے اس صورت حال کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے:

پچھلے دور میں امت کو جو سب سے خطرناک مرض لاحق ہوا ہے، وہ ہے اختلاف اور مخالفت۔ ذوق، رجحانات، کردار، طرز حیات، اخلاق یہاں تک کہ عقائد و نظریات، افکار و آرا، گفتگو کے انداز، ہر شے اور ہر معاملے میں اختلاف؛ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس امت کے پاس جتنے اوامر و نواہی ہیں، سب اختلاف اور مار دھاڑ کو ہی ہوا دے رہے اور اسی راہ پر لگا رہے ہیں؛ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ کتاب اللہ اور سنت رسول نے اسلامی توحید کے بعد باہمی اختلافات سے اجتناب، تعلقات کو مکدّر اور اسلامی اخوت کو مجروح کرنے والی ہر چیز کے ازالے اور امت مسلمہ کے اتحاد پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ مبادیِ اسلام نے بھی شرک باللہ کے بعد تخریبی اختلافِ امت ہی کو سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ سمجھ کر ایمان باللہ اور اتحاد مسلمین قائم رکھنے ہی کی ترغیب دی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی واضح دعوت بھی یہی ہے کہ ایک ایسی امت وجود میں آئے، جو یک جسم و جان بن کر رہے اور کسی کو بھی تکلیف پہنچے تو ہر ایک اس کو اپنا درد اور تکلیف محسوس کرے۔

اسلام ایک قابلِ عمل دعوت ہے جو انسانوں کے حالات و معاملات کے مطابق ان سے پیش آتا ہے۔ خالق کائنات جو اپنی مخلوق پر بے حد مہربان ہے، وہ اسے سب سے زیادہ جانتا اور سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے بندوں کو ایک دوسرے سے مختلف صلاحیت ولیاقت اور عقل و دانش عطا فرمائی ہے، جس سے فطری طور پر ان کے خیالات اور افکار و نظریات اور دیگر بہت سی چیزوں میں باہمی اختلاف پیدا ہوا ہے۔ اسلام بھی کھلے دل سے ایسے سنجیدہ اختلاف کی اجازت دیتا ہے جس سے اسلامی وحدت کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ بڑے مسائل اور بنیادی قواعد میں یکساں موقف اور

Marfat.com

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ علم و معرفت میں پیش قدمی اور اضافے کی وجہ سے کسی کا نقطۂ نظر بعض امور میں کئی لوگوں سے مختلف اور اچھوتا ہو سکتا ہے اور اسے معاشرے کے ایک بڑے طبقے میں پذیرائی اور قبولیت بھی حاصل ہو سکتی ہے، لیکن خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے، جب اپنی رائے کو قطعیت کا درجہ دے کر منوانے اور دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ گزشتہ چند صدیوں سے مسلم سماج کے بعض انفرادیت پسند لوگ مذکورہ رویے کا شکار ہو گئے ہیں؛ جس کا نتیجہ معاشرتی ٹوٹ پھوٹ، باہمی جنگ و جدل، محاذ آرائی حتیٰ کہ ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ حالانکہ بہت سے امور میں سلف صالحین کے درمیان بھی اختلاف رہا اور اس کی نوعیت بھی کچھ معمولی نہیں تھی، بہت سے مسائل میں حلال و حرام تک کا اختلاف تھا؛ لیکن تفریق اور انتشار کا وہ ماحول، جس کا ہم شکار ہیں، سلف کے ہاں اس کا شائبہ تک نہ تھا۔ تمام تر اختلافی آرا کے باوجود ان کے ہاں ایک دوسرے کے احترام میں کبھی فرق نہیں آیا اور باہمی خیر خواہی کے جذبات کبھی ماند نہ پڑنے پائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے اختیار کردہ موقف پر دلائل کی رُو سے ذاتی طور پر مطمئن ہونے کے باوجود دوسرے اہل علم کی رائے کو بھی قابل قدر سمجھتے تھے۔ معاصرانہ کشاکش کے باوجود ان کے قلوب کینے اور بغض و عناد جیسے باطنی امراض سے پاک تھے۔ ایک امام کے شاگرد اپنے استاد کے معاصر ائمہ کی شاگردی اختیار کرنے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے تھے۔

اختلاف اور مخالفت کا واضح فرق، جسے سمجھنے کے لیے کسی افلاطونی عقل کی ضرورت نہیں، بصد افسوس ہمارے اہل دانش کی نگاہوں اور رویوں سے اوجھل ہے۔

Marfat.com

ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی نے اس صورت حال کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے:

پچھلے دور میں امت کو جو سب سے خطرناک مرض لاحق ہوا ہے، وہ ہے اختلاف اور مخالفت۔ ذوق، رجحانات، کردار، طرز حیات، اخلاق یہاں تک کہ عقائد و نظریات، افکار و آرا، گفتگو کے انداز، ہر شے اور ہر معاملے میں اختلاف؛ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس امت کے پاس جتنے اوامر و نواہی ہیں، سب اختلاف اور مار دھاڑ کو ہی ہوا دے رہے اور اسی راہ پر لگا رہے ہیں؛ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ کتاب اللہ اور سنت رسول نے اسلامی توحید کے بعد باہمی اختلافات سے اجتناب، تعلقات کو مکدّر اور اسلامی اخوت کو مجروح کرنے والی ہر چیز کے ازالے اور امت مسلمہ کے اتحاد پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ مبادیِ اسلام نے بھی شرک باللہ کے بعد تخریبی اختلافِ امت ہی کو سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ سمجھ کر ایمان باللہ اور اتحاد مسلمین قائم رکھنے ہی کی ترغیب دی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی واضح دعوت بھی یہی ہے کہ ایک ایسی امت وجود میں آئے، جو یک جسم و جان بن کر رہے اور کسی کو بھی تکلیف پہنچے تو ہر ایک اس کو اپنا درد اور تکلیف محسوس کرے۔

اسلام ایک قابلِ عمل دعوت ہے جو انسانوں کے حالات و معاملات کے مطابق ان سے پیش آتا ہے۔ خالق کائنات جو اپنی مخلوق پر بے حد مہربان ہے، وہ اسے سب سے زیادہ جانتا اور سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے بندوں کو ایک دوسرے سے مختلف صلاحیت ولیاقت اور عقل و دانش عطا فرمائی ہے، جس سے فطری طور پر ان کے خیالات اور افکار و نظریات اور دیگر بہت سی چیزوں میں باہمی اختلاف پیدا ہوا ہے۔ اسلام بھی کھلے دل سے ایسے سنجیدہ اختلاف کی اجازت دیتا ہے جس سے اسلامی وحدت کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ بڑے مسائل اور بنیادی قواعد میں یکساں موقف اور

Marfat.com

اصولی تصورات میں اتفاق رائے ہو، تو اتنا ہی کافی ہے۔ فروعی امور اور ثانوی معاملات کا جہاں تک تعلق ہے تو بہتر اور خوب تر کی تلاش میں اختلاف رائے ہونے میں کوئی حرج نہیں؛ بشرطیکہ یہ اختلاف اپنے حدود وضوابط اور اصول وآداب کا پابند ہو اور امت کی وحدتِ فکر اور اس کے بنیادی مسائل میں اس کے موقف پر اثر انداز نہ ہوتا ہو۔[1]

مسلمانوں کے دور انحطاط میں جب ابھی علمی مباحثوں اور مناقشوں نے شدت کا رنگ اختیار نہیں کیا تھا، اہل علم کے اختلافات مقررہ حدود و قیود عبور نہیں کرتے تھے؛ لیکن کلامی مسائل میں اختلاف اور مناظروں کی کثرت ہونے لگی تو کئی اہل علم کو اصول اختلاف پر قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس سلسلے میں جو سب سے قدیم کتاب دستیاب ہے، وہ ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن السید البطلیَوسی (م۵۲۱ھ) [دار الفکر، دمشق۱۹۸۷] کی کتاب: الإنصاف في التنبيه على الأسباب التي أوجبت الاختلاف بين المسلمين في آرائهم ہے۔اس موضوع پر چند دیگر کتب درج ذیل ہیں:

- شیخ الإسلام ابن تیمیہ (م۷۲۸ھ)، رفع الملام عن الأئمّة الأعلام، یہ کتاب کافی مقبول ہے اور کئی ممالک میں چھپی ہے۔
- عضد الدین عبد الرحمن بن احمد الإیجی (م۷۵۶ھ)، آداب البحث، اس رسالے نے اپنے دور میں بہت مقبولیت حاصل کی اور اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔

۱۔ مقدمہ أدب الاختلاف في الإسلام، ص۱۹ (کتاب الأمة ایڈیشن۱۹۸۴ء)

Marfat.com

- طاش کبری زادہ، احمد بن مصطفیٰ (م۹۶۸ھ) ، رسالة الآداب (في علم آداب البحث والمناظرة) ، اس رسالے میں علم مناظرہ اور اس کے قواعد وضوابط اور مناظرے میں سوال وجواب کے آداب تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔
- شیخ الإسلام مصطفیٰ صبری (م۱۲۸۶ھ) ، علم آداب البحث والمناظرة
- الشنقیطی، محمد الأمین الجکنی (م۱۳۹۴ھ) ، علم آداب البحث والمناظرة
- شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م۱۱۷۶ھ) ، الإنصاف في بيان سبب الاختلاف (اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ)
- محمد حیات سندھی (م۱۱۶۳ھ)، الإيقاف على سبب الاختلاف
- شیخ علی الخفیف (م۱۳۹۸ھ) ، أسباب اختلاف الفقهاء
- شیخ عبدالجلیل عیسیٰ (م۱۴۰۱ھ) ، ما لا يجوز الاختلاف فيه بين المسلمين
- مصطفی ابراہیم الزلمی (معاصر) ، أسباب اختلاف الفقهاء في الأحكام الشرعية
- ڈاکٹر مصطفی سعید الخن ، أثر الاختلاف في القواعد الأصولية في اختلاف الفقهاء (قواعدِ اصولیہ میں فقہا کا اختلاف اور فقہی مسائل پر ان کا اثر)
- ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن ترکی ، أسباب اختلاف الفقهاء
- ڈاکٹر مصطفی دیب البغا ، أثر الأدلة المختلف فيها
- محمد أبوالفتح البیانونی ، دراسات في الاختلاف الفقهية

Marfat.com

▪ محمد عوّامہ ، أدب الاختلاف في مسائل العلم والدين

یہ کتاب بنیادی طور پر ڈاکٹر طہ جابر فیاض العلوانی کی معروف تالیف أدب الاختلاف في الإسلام کے اردو ترجمہ پر مشتمل ہے جو ۸۷-۱۹۸۶ء میں ماہنامہ "ترجمان القرآن" لاہور میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ اُس وقت اس کا ایک مختصر حصہ ترجمہ نہ ہو سکا تھا، چنانچہ کتاب کی تکمیل کی خاطر جناب ایم اختر کے ہندوستان سے شائع شدہ ترجمے سے وہ حصہ ضروری اصلاح وترمیم کے ساتھ شاملِ اشاعت کر دیا گیا ہے۔ نیز فصل سوم میں شیخ بیانونی کی مذکورہ بالا کتاب دراسات في الاختلافات الفقهية سے بھی کچھ لوازمہ شامل کیا گیا ہے۔

اہلِ علم کا سلیقۂ اختلاف مسلم امت کے اہم مسئلے کے حوالے سے شعور بیدار کرنے کی ایک وقیع کوشش ہے۔ امت کو آج جس شدت پسندی اور فکری بحران کا سامنا ہے، یہ اس کی نشان دہی اور مسلمانوں کو ان آداب کی یاددہانی کی ایک صدا ہے جو طویل عرصہ گزرنے کی وجہ سے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ بے لگام اختلاف اور خواہش نفس کے سرکش گھوڑے کی اندھا دھند سواری؛ امت مسلمہ کے موجودہ امراض میں دو خطرناک مرض ہیں، اس بات کو باور کرایا گیا ہے کہ ان کا مقابلہ اور ان کے اثراتِ بد سے محفوظ رہنا، امت کے فکری بحران کے حل اور مناہج و اسالیب کی اصلاح اور ترتیبِ نو کی راہ میں اولین شرط ہے۔

Marfat.com

یہ کتاب معاصر اہل ایمان کو اجتہاد و استنباط اور رائے کے استعمال کے حوالے سے سلف صالحین کے طریق کار اور قواعد و ضوابط سے روشناس کرنے کی ایک بلند پایہ علمی کاوش ہے، جس میں انہیں خبر دار کیا گیا ہے کہ وہ اپنے تہذیبی کردار کا ادراک کریں، شریعت کے کلیات اور مقاصد و اہداف کو پیش نظر رکھیں اور جزئیات اور فروعی مسائل کو ان کے حقیقی تناظر میں دیکھیں۔

امید ہے فقہی اختلافات کی حقیقت کو سمجھنے اور اختلافات میں راہِ اعتدال کی نشان دہی کے حوالے سے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔ وباللہ التوفیق.

عبدالحی ابڑو

۱۸۔ مارچ ۲۰۱۵ء

Marfat.com

Marfat.com

فصل اول

اختلاف اور متعلقہ اصطلاحات کی تعریف

اختلاف اور خلاف

اختلاف اور مخالفت عربی الفاظ ہیں، جن کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے اس کے کسی قول یا فعل میں الگ راہ اختیار کرے۔ خلاف کے لفظ میں ضد (یا عکس) کے مقابلے میں زیادہ عموم پایا جاتا ہے، اس لیے کہ دو ضد یا عکس لازمی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ جبکہ دو مختلف چیزوں کے لیے ضروری نہیں کہ ایک دوسرے کی ضد (یا ایک دوسرے کا عکس) بھی ہوں۔ عام طور پر کسی بات میں لوگوں کے اختلاف کا نتیجہ چونکہ جھگڑے اور تنازع کی صورت میں نکلتا ہے اس لیے مجازی طور پر اختلاف کا لفظ تنازعے اور جھگڑے کے معنٰی میں بولا جاتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ﴾ [مریم۱۹: ۳۷] (مگر پھر مختلف گروہ باہم اختلاف کرنے لگے)، ﴿وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ﴾ [ھود۱۱: ۱۱۸] (مگر اب تو وہ مختلف طریقوں پر ہی چلتے رہیں گے)، ﴿إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُخْتَلِفٍ﴾ [الذاریات۵۱: ۸] (تمہاری [کفار کی] بات ایک دوسرے سے مختلف ہے)، ﴿إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ﴾ [یونس۱۰: ۹۳] (یقیناً تیرا رب قیامت کے روز ان کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کر دے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں)۔

اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خلاف اور اختلاف سے مراد کسی بات، رائے، حالت وہیئت یا کسی موقف میں مطلق مغایرت (یا دُوری) ہے۔

Marfat.com

فقہا کے ہاں جو علم الخلاف کی اصطلاح مشہور ہے، اس سے ایسا علم مراد ہے جس کے ذریعے کسی امام کی استنباط کردہ فقہی جزئیات کو حفظ کیا جاتا ہے اور کسی مخصوص دلیل کے بغیر اس کی مخالف آرا کو رد کر دیا جاتا ہے، اس لیے کہ اگر ان جزئیات کے ساتھ کوئی دلیل پیش کی جائے تو ایسا شخص مجتہد یا اصولی کہلائے گا، جبکہ 'خلافی' (علم الخلاف کے ماہر) کے لیے باور یہ کیا جاتا ہے کہ اسے فقہ کے دلائل سے سروکار نہیں ہوتا، بلکہ وہ کسی مسئلے کے حکم کے بارے میں صرف اپنے امام کی رائے کو کافی سمجھتا ہے جسے اس نے اپنی رائے سے تلاش کیا ہے۔ اسی طرح اس کے امام کا قول کسی اور کے قول کو رد کر دینے کے لیے اس کے ہاں کافی دلیل ہوتا ہے۔

جدل اور علم الجدل

جب فریقین میں سے دونوں یا کوئی ایک اپنی رائے یا موقف کو قابلِ اعتماد شمار کرتے ہوئے اس کا دفاع کرے اور دوسروں سے بھی اس رائے کو منوانے یا اختیار کرانے کی کوشش کرے تو ایسی کوشش کو جدل کہا جاتا ہے۔

لغوی معنٰی کے لحاظ سے جدل کا مطلب ہے: تنازع میں غلبہ حاصل کرنے کے طور پر گفتگو کرنا۔ جبکہ علم الجدل سے مراد ایسا علم ہے جس کے ذریعے مختلف فقہی اقوال کے دلائل میں تقابل کر کے قابلِ ترجیح قول کو واضح کیا جائے۔

بعض علما نے علم الجدل کی تعریف ان الفاظ سے کی ہے: یہ ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے کسی مطلوبہ مقصد کی حمایت و تائید کرنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، چاہے وہ

Marfat.com

مقصد غلط اور باطل ہی کیوں نہ ہو، اور اس کی مخالف بات کو ساقط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، چاہے وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔[1]

اس تعریف میں جدل کے لغوی معنٰی کا اثر صاف طور پر نظر آتا ہے، اس لیے کہ اس تعریف کے مطابق جدل ایسا علم ہے جس کی بنیاد مخصوص دلائل پر نہیں، بلکہ یہ ایک ملکہ اور ذہنی استعداد ہے جسے کوئی بھی شخص حاصل کر سکتا ہے، چاہے وہ قرآن وسنت اور دیگر علوم سے بے بہرہ ہی کیوں نہ ہو۔

شقاق

خلاف اور جدل کے بعد اسی سیاق میں ایک اور لفظ بھی استعمال ہوتا ہے اور وہ ہے "شقاق"۔

جب اختلاف کا شکار ہونے والے فریقین کے مابین تنازع شدت اختیار کر جائے، اور دونوں میں سے ہر ایک حق اور راستی کی تلاش کے بجائے صرف غلبہ حاصل کرنا چاہے اور مفاہمت اور اتفاق رائے مشکل ہو جائے تو ایسی حالت کو شقاق کا نام دیا جاتا ہے۔ شقاق کے اصلی معنٰی یہ ہیں کہ فریقین میں سے ہر ایک کسی جگہ کے الگ الگ شق (حصے) میں ہو، گویا ایک جگہ دونوں کے لیے ناکافی ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا﴾ [النساء۴: ۳۵] یعنی تمہیں میاں بیوی کے درمیان ایسے سخت اختلاف کا ڈر ہو کہ جس کے نتیجے میں ایسا تنازعہ پیدا ہو گا جس سے دونوں کی راہ (یا جگہ) الگ الگ ہو جائے گی۔ دوسری آیت ﴿فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ﴾ [البقرۃ۲: ۱۳۷] میں بھی شقاق کا لفظ اسی معنٰی میں استعمال ہوا ہے۔

۱۔ دیکھیے: طاش کبری زادہ، مفتاح السعادۃ ۲: ۵۹۹؛ جرجانی، التعریفات، ص۶۶

Marfat.com

مذموم اور مستحسن اختلاف

مشیتِ ایزدی کا تقاضا تھا کہ لوگوں کو عقل و فہم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف پیدا کیا جائے، ان کی زبانیں، رنگ، سوچ اور فکر کے انداز بھی مختلف ہوں۔ ان کا نتیجہ اختلافِ رائے کی صورت میں برآمد ہونا قدرتی امر تھا۔ جیسا کہ ہماری زبانوں، رنگوں اور شکل وصورت میں تنوع پایا جاتا ہے اور یہ اختلاف قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، اسی طرح ہماری عقلوں، نقطہ ہائے نظر اور ان سے جنم لینے والی آرا کا اختلاف بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور اس کی قدرتِ کاملہ پر ایک دلیل ہے۔ بلاشبہہ اس کائنات کی تعمیر و ترقی اور اس میں زندگی کا قیام اس صورت میں ممکن نہ تھا اگر تمام انسان ہر چیز میں یکساں پیدا کیے جاتے۔ لیکن اب ہر ایک اپنے اس کام میں مصروف ہے جس کے لیے اسے تخلیق کیا گیا ہے: ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ. إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ﴾ [ھود ۱۱: ۱۱۸- ۱۱۹] (اگر تیرا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک گروہ بنا سکتا تھا، مگر اب تو وہ مختلف طریقوں ہی پر چلتے رہیں گے اور بے راہ رویوں سے صرف وہ لوگ بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے)۔

اسلافِ امت کے درمیان جو اختلاف واقع ہوا (اور آج بھی موجود ہے)، وہ اس قدرتی مظہر کا ایک حصہ ہے، اگر اختلاف اپنی مقررہ حدود سے تجاوز نہ کر جائے اور اپنے آداب و قواعد کا پابند رہے تو یہ ایک مثبت چیز ہے جس کے بے شمار فائدے ہیں۔

مستحسن اختلاف کے چند فوائد

اگر اختلاف اپنی حدود کے اندر رہے اور اس سے تجاوز نہ کر جائے، نیز لوگ اختلاف کے آداب و طریق کار کو اپنا لیں تو اس کے کئی مثبت پہلو ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں:

Marfat.com

ا۔ اگر نیت درست ہو تو ایسے اختلاف کے ذریعے ایک ہی معاملے کے کئی پہلو معلوم کرنے میں مدد ملتی ہے، ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ کسی طور پر شرعی دلائل پر پورے اترتے ہوں۔

۲۔ ایسے اختلاف کے ذریعے اذہان کی ریاضت و مشق ہوتی ہے، افکار و خیالات کا تبادلہ ہوتا ہے، مختلف عقلیں جن احتمالات تک پہنچ سکتی ہیں، ان تک پہنچنے کے لیے غور و فکر کی راہیں کھلتی ہیں۔

۳۔ جس شخص کو کوئی واقعہ یا کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے ایسے اختلاف کے ذریعے اس کے سامنے کئی حل ہوتے ہیں، تاکہ ان میں سے جو اسے اس لحاظ سے مناسب لگے کہ دین کی آسانی کے تصور سے قریب تر ہو (اس لیے کہ دین انسانوں کی روزمرہ زندگی میں پیش آمدہ مسائل و واقعات کے حل بتاتا ہے) اسے اختیار کر لے۔

یہ اور اس طرح کے دیگر بے شمار فوائد، اختلاف سے اس وقت حاصل کیے جا سکتے ہیں، جب اختلاف ان حدود و آداب کا پابند رہے، جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے؛ لیکن اگر ان حدود و قیود کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو یہ اختلاف جھگڑے، ضد اور ہٹ دھرمی کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جس کے نتائج نہایت ہی خطرناک صورت میں نکلتے ہیں، امت میں تفرقہ پیدا ہوتا ہے اور اختلاف تعمیر کے بجائے بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے۔

مختلف عوامل کے لحاظ سے اختلاف کی مختلف قسمیں ہیں، مثلاً:

ا۔ خواہش نفس کی بنیاد پر اختلاف

کبھی اختلاف کی بنیاد کسی ذاتی مفاد یا غرض کی تکمیل کے لیے پیدا شدہ نفسانی خواہش ہوتی ہے یا اپنے علم و فہم اور فقہ دانی کی نمود و نمائش کا جذبہ اختلاف کا محرک

Marfat.com

ہوتا ہے، ایسے اختلاف کی تمام شکلیں بری ہیں۔ اس لیے کہ اس میں خواہشِ نفس کا حصہ تلاشِ حق کے جذبے پر غالب رہتا ہے، جبکہ خواہشِ نفس کبھی بھلائی اور خیر کا ذریعہ نہیں بنتی، بلکہ یہ کفر و ضلالت کی طرف لے جانے والی شیطانی سواری ہے۔ ارشاداتِ ربانی ہیں: ﴿أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى أَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ﴾ [البقرۃ۲: ۸۷] (یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشِ نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمہارے پاس آیا، تو تم نے اس کے مقابلے میں سرکشی ہی کی، کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا)۔ ﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَى أَنْ تَعْدِلُوا﴾ [النساء۴: ۱۳۵] (اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کے لیے عدل کا دامن نہ چھوڑا)۔ ﴿قُلْ لَا أَتَّبِعُ أَهْوَاءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ﴾ [الانعام۶: ۵۶] (کہو، میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا، اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو گیا۔ راہ راست پانے والوں میں سے نہ رہا)۔ ﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ﴾ [ص۳۸: ۲۶] (خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ وہ تجھے اللہ کے راہ سے بھٹکا دے گی)۔ ﴿وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ﴾ [المؤمنون۲۳: ۷۱] (حق اگر کہیں ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین اور آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا)۔ ﴿وَإِنَّ كَثِيرًا لَيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ [الانعام۶: ۱۱۹] (بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں)۔

خواہشِ نفس کی کئی قسمیں اور متعدد طریقے ہیں، تمام کا محور ہوس، خود پسندی اور انانیت ہے۔ یہی خواہشِ نفس کئی گمراہیوں اور متعدد انحرافات کو جنم دیتی ہے۔ جو اس کے جال میں پھنس جاتا ہے وہ اس کے لیے باطل سے قریب اور حق سے دور کر

Marfat.com

دینے والی ہر چیز کو خوش نما بنا کر پیش کرتی ہے۔ یہاں تک کہ حق اس کے سامنے باطل اور باطل حق کی شکل اختیار کر لیتا ہے (العیاذ باللہ)۔ کئی گمراہ اقوام کے تفرقوں اور دینِ حق میں بدعات گھڑنے والوں کے اختلاف کا سبب اسی آفت (خواہشِ نفس) کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر یہ مہربانی اور کرم ہے کہ اس نے انہیں صحیح افکار و عقائد کو خواہشِ نفس کے عمل دخل سے بالاتر رکھنے کی ہمت و توفیق بخشی، ورنہ وہ انہیں گمراہی کے گڑھے کی طرف دھکیل دیتی۔ خدا نے اپنے بندوں کے دلوں میں ایمان کی شمعیں روشن کیں، تاکہ ان کے ذریعے وہ مذاہب و نظریات اور اعتقادات کے کھوٹے اور کھرے میں تمیز کر سکیں۔ اس لیے کہ ان کے سچے اور جھوٹے ہونے کا کوئی ظاہری وجود تو ہے نہیں، البتہ ان کا ایک ذہنی اور معنوی وجود ضرور ہے، جسے خواہشِ نفس خوش نما بنا کر نفس کے سامنے پیش کرتی ہے، اگرچہ فی الواقع وہ باطل ہی کیوں نہ ہو۔

اختلاف میں نفس پرستی کی جانچ

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کسی نظریے یا فکر میں خواہشِ نفس کا کس حد تک اثر ہے، کئی ذرائع ہیں: کچھ بیرونی اور کچھ داخلی۔

ا۔ کسی بھی فکر کے پیچھے خواہش کے عمل دخل کو معلوم کرنے کے بیرونی ذرائع میں سے ایک یہ ہے کہ وہ فکر یا نظریہ قرآن و سنت کے صریح احکام سے ٹکراتا ہو۔ اس لیے کہ حق کے متلاشی ہونے کے دعوے دار کسی شخص سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایسی فکر کی پیروی کرے گا جو کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ سے متصادم ہو۔

Marfat.com

ان ذرائع میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ فکر یا نظریہ عقلِ سلیم سے ٹکراتا ہو، جیسے کوئی نظریہ اگر غیر اللہ کی عبادت، یا لوگوں کی زندگیوں میں شریعتِ الٰہی کو چھوڑ کر دیگر قوانین کو نافذ کرنے کی دعوت دیتا ہو، یا زنا، شراب نوشی، سود خوری جیسے ہلاکت خیز گناہوں کو مباح ٹھہراتا ہو، یا جھوٹ کو اچھا ثابت کرتا ہو، یا فضول خرچی پر ابھارتا ہو، تو ایسا نظریہ بلاشبہہ خواہش نفس ہی کی پیداوار ہو سکتا ہے، اور اس کی طرف بلانے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جس کی زمام کار شیطان کے ہاتھ میں ہو۔

۲۔ خواہش نفس کی دخل اندازی کو معلوم کرنے کا دوسرا ذریعہ داخلی ہے۔ کسی بھی فکر یا نظریے کے ماخذ کے بارے میں تھوڑی سی سوچ بچار کرنے اور صدق دل کے ساتھ اپنی ذات کو ٹٹولنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم کیا جائے کہ ایسے نظریے کے حامل شخص کے اردگرد کے حالات کا اس پر کتنا اثر ہے؟ اگر یہ حالات تبدیل ہو جائیں تو وہ کس حد تک اپنے اس نظریے پر قائم رہ سکتا ہے؟ کیا کوئی ایسا لاشعوری دباؤ تو موجود نہیں جس نے اسے اس راہ پر چلنے پر مجبور کر دیا ہے؟ اس کے بعد خود اس نظریے کے متعلق تحقیق کی جانی چاہیے۔ اگر اس کے اندر جھول ہو اور چند جذبات کی بنا پر کبھی مضبوط اور کبھی کمزور پڑ جاتا ہو تو سمجھ لیجیے کہ ایسا نظریہ یا نظامِ فکر خواہش نفس کی پیداوار اور شیطانی وسوسہ ہے جس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے خواہشاتِ نفس کی رو میں بہہ جانے سے قبل راہِ حقیقت سُجھا دی۔

۱۴۲۲۶۴

Marfat.com

۲۔ حق کی بنیاد پر اختلاف

کبھی اختلاف ایسا ہوتا ہے جس میں خواہش نفس کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا، ایسے اختلاف کی بنیاد حق پر ہوتی ہے، علم و عقل اس کے متقاضی ہوتے ہیں اور ایمان اسے فرض قرار دیتا ہے۔ جیسے اہل ایمان کا کفر، شرک اور نفاق والوں سے اختلاف ایسا فرض ہے جس سے کوئی مسلمان انحراف نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے ختم کرنے کی دعوت دے سکتا ہے، اس لیے کہ اس کی بنیاد ایمان اور حق پر ہے۔ اسی طرح مسلمان کا کافرانہ اور لادینی عقائد رکھنے والوں (جیسے یہودیت، عیسائیت، بت پرستی اور کمیونزم) کے ساتھ اختلاف کی بھی یہی صورت ہے۔ البتہ ان اقوام اور عقائد کے ساتھ اختلاف اس بات میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے کہ اس کے اسباب کو (بذریعہ دعوت) ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ تاکہ لوگ اللہ کے دین میں داخل ہو جائیں اور اس اختلاف کے اسباب مثلاً کفر، شرک، ہٹ دھرمی، منافقت، برے اخلاق، الحاد و لادینیت، بدعات اور ایسے منکرات کی ترویج و اشاعت سے باز آجائیں۔

۳۔ اختلاف میں مستحسن اور مذموم دونوں پہلو

بعض اوقات اختلاف میں مثبت اور منفی دونوں پہلو پائے جاسکتے ہیں، اور یہ ان فقہی جزئیات میں اختلاف ہے جن کے حکم کے بارے میں متعدد احتمالات ہو سکتے ہیں۔ جن میں سے مختلف اسباب اور دلائل کی روشنی میں کسی ایک حکم کو ترجیح دی جاسکتی ہو (جن کے بارے میں بحث آگے آئے گی)۔ اس تیسری قسم کی کئی مثالیں ہیں۔ جیسے کسی زخم سے نکلنے والے خون، یا جان بوجھ کر قے کرنے پر وضو کے ٹوٹ جانے یا نہ ٹوٹنے کے بارے میں اختلاف، یا قراءت خلف الامام؛ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنے اور

Marfat.com

آمین زور سے کہنے کے بارے میں علما کا باہمی اختلاف اور اسی طرح کی دیگر بے شمار مثالیں۔ اختلاف کی اس قسم میں لغزشِ فکر کا بڑا امکان ہے، اس لیے کہ اس میں ممکن ہے کہ خواہشِ نفس تقویٰ کے ساتھ، علم ظن و تخمین کے ساتھ، راجح مرجوح کے ساتھ اور مردود مقبول کے ساتھ گڈ مڈ ہو جائے۔ ان خطروں سے بچنے کی صورت یہی ہے کہ ایسے قواعد و ضوابط کی پابندی کی جائے جنہیں اختلاف کی صورت میں فیصل بنایا جاسکے اور جو اس اختلاف کو متعین حدود میں رکھیں۔ ورنہ اختلاف، ضد، ہٹ دھرمی اور لاحاصل تنازع کی صورت اختیار کرلے گا اور فریقین تقویٰ اور للّٰہیت کے مقام سے خواہشِ نفس کے گڑھے میں جا گریں گے۔ فکری انتشار نمودار ہو گا اور شیطان کو اپنے سینگ اٹھانے کا موقع ملے گا۔

اختلاف کے بارے میں علما کی رائے

اس تفصیل کے باوجود، چند علماے امت نے ہر قسم کے اختلاف سے بچنے کی تاکید کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "اختلاف شر ہے۔"[1]

سبکیؒ[2] کہتے ہیں: "..... رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ اختلاف نہ ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَكِنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ﴾ [البقرۃ ۲: ۲۵۳] (مگر انہوں نے باہم اختلاف کیا، پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی)۔ اسی طرح سنتِ رسول ﷺ میں بھی یہی ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: إنما هلك من كان قبلكم

۱۔ سنن ابوداؤد، کتاب المناسك، باب الصلاة بمنى، حدیث ۱۹۶۰

۲۔ السبکی، الإبهاج في شرح المنهاج ۳: ۱۳

Marfat.com

لكثرة سؤالهم واختلافهم على أنبيائهم[1] (یقیناً تم سے پہلے کی اقوام کثرتِ سوال اور اپنے انبیا کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے برباد ہوئیں)۔

اس بارے میں بے شمار آیات و احادیث موجود ہیں۔ امام سبکیؒ نے اختلاف کی تیسری قسم (جو مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کی حامل ہو سکتی ہے، کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ کہتے ہیں: "اختلاف کی تین قسمیں ہیں۔ پہلے بنیادی اصول میں اختلاف، اسی کا ذکر قرآن مجید (کی پچھلی آیات) میں ہوا ہے۔ بلاشبہہ ایسا اختلاف بدعت و گمراہی ہے۔ دوسرے جنگی حکمت عملی وغیرہ کے بارے میں اختلاف، یہ بھی ناجائز ہے، اس لیے کہ اس کی وجہ سے امت کے مفادات کو نقصان پہنچتا ہے۔ تیسرے فروع اور جزئیات میں اختلاف، جیسے کسی چیز کے جائز یا ناجائز وغیرہ ہونے میں اختلاف۔" اس کے بارے میں ان کی رائے کے مطابق، اتفاق رائے اختلاف سے بہتر ہے۔ سبکیؒ نے یہاں اختلاف کی مذمت میں ابن حزم ظاہریؒ کے ایک قول کا بھی حوالہ دیا ہے، جس میں انہوں نے کسی بھی اختلاف کو "رحمت" نہیں کہا، بلکہ تمام اختلافات کو عذاب ہی قرار دیا ہے۔

اختلاف کے نقصانات اور خطرات کو جاننے کے لیے یہی کافی ہے کہ اللہ کے نبی ہارون علیہ السلام نے اختلاف کو بتوں کی عبادت سے زیادہ خطرناک اور ضرر رساں شمار کیا۔ جب سامری نے اپنی قوم کی پوجا کے لیے سونے کا ایک بچھڑا تیار کیا اور انہیں کہا کہ "یہ (معاذ اللہ) تمہارا اور موسیٰؑ کا معبود ہے" تو حضرت ہارونؑ نے خاموشی اختیار کرلی اور اپنے بھائی (موسیٰؑ) کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ جب موسیٰؑ آئے اور قوم کو

۱۔ سنن ترمذی، أبواب العلم، باب في الانتهاء عما نهى عنه رسول الله ﷺ، حدیث ۲۶۷۹

Marfat.com

بچھڑے کی عبادت کرتے پایا تو اپنے بھائی کو سخت ملامت کی۔ یہاں ان کے بھائی نے یہ عذر پیش کیا کہ: "اے میری ماں کے بیٹے، میری داڑھی نہ پکڑ، نہ میرے سر کے بال کھینچ، مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آکر کہے گا کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی، اور میری بات کا پاس نہ کیا۔" [طٰہٰ: ۹۴] تو حضرت ہارون نے قوم کے افتراق اور اختلاف کو اس بات کا عذر بنا کر پیش کیا کہ وہ اس اندیشے سے انہیں زیادہ سختی سے نہ روک سکے اور مقابلہ نہ کیا۔

Marfat.com

اختلاف کی تاریخ

عہدِ نبویؐ میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف

مذکورہ بالا مفہوم کے لحاظ سے عہد نبویؐ میں اختلاف کے پائے جانے کی کوئی وجہ موجود نہیں تھی۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سب کے لیے مرجع تھی۔ وہ تمام معاملات آپ کے سامنے رکھتے اور ان کے بارے میں راہنمائی حاصل کرتے اور حضور ﷺ راہِ حق وہدایت کی نشان دہی فرمادیتے تھے، لیکن جو لوگ مدینہ منورہ سے دور ہوتے چونکہ ان کے لیے حضور ﷺ کی طرف رجوع کرنا مشکل تھا، اس لیے ان کے درمیان اختلاف واقع ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ خاص طور پر کتاب اللہ یا سنتِ رسول کی تفسیر اور پیش آمدہ واقعات پر انہیں منطبق کرنے کی صورت میں یا کبھی کسی مسئلے کے بارے میں کوئی صریح نص نہ پانے کی صورت میں وہ اجتہاد کرتے۔ ان کا اجتہاد بعض اوقات ایک دوسرے سے تھوڑا بہت مختلف بھی ہوتا۔ ایسے لوگ جب مدینہ واپس آتے تو نصوص سے اپنی فہم کے مطابق حاصل کردہ مفہوم یا اجتہادی مسائل حضورؐ کے علم میں لاتے، تو آنحضور ﷺ یا تو انہیں درست قرار دیتے جو سنت کا حصہ بن جاتا، یا درست مسئلہ بیان فرمادیتے جس پر وہ مطمئن ہو جاتے اور اسے اخذ کر لیتے۔ اس طرح اختلاف ختم ہو جاتا۔ اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

ا۔ بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے جنگِ احزاب کے دن فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص بھی بنو قریظہ کی آبادی تک پہنچنے سے پہلے نمازِ عصر نہ پڑھے۔"

Marfat.com

کچھ لوگوں کو عصر کا وقت راستے میں پیش آگیا۔ (ان میں سے) بعض نے کہا: "ہم بنو قریظہ کے علاقے تک پہنچنے سے پہلے نماز نہیں پڑھیں گے۔" دوسرے حضرات نے کہا "ہم تو نماز پڑھ لیتے ہیں، حضور ﷺ کا منشا یہ نہیں تھا۔" یہ بات (واپسی میں) حضور ﷺ کے علم میں لائی گئی، تو آپ ﷺ نے کسی کو سرزنش نہیں فرمائی۔[1]

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ نمازِ عصر کی ادائگی کے سلسلے میں صحابہؓ آپس میں دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ نے (منطق کی اصطلاح کے مطابق) ظاہر اللفظ یا (حنفی علماے اصول کی اصطلاح کے مطابق) عبارۃ النص پر عمل کیا، جبکہ دوسرے گروہ نے نص سے ایک معنیٰ و مفہوم اخذ کرکے اس کے ساتھ اس کی تخصیص کر دی۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دونوں کے طرزِ عمل کو درست قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں گروہ حق پر تھے۔

اس سے ثابت ہوا کہ مسلمان کو کسی نص کے ظاہری معنیٰ لینے کا بھی حق حاصل ہے اور اسی طرح اس سے ایسے دوسرے معانی اخذ کرنے کا بھی جن کا احتمال اس کے اندر موجود ہو، اور اس کے لیے دلیل بھی پیش کی جاسکتی ہو۔ جب وہ ایسی کوشش کا اہل ہو تو اس کا یہ عمل قابلِ گرفت نہیں ہوگا۔ صحابہؓ کے دوسرے گروہ نے اس ارشاد سے یہ سمجھا کہ حضور ﷺ چاہتے تھے کہ جانے میں بہت تیز رفتاری سے کام لیا جائے۔ اس لیے انہوں نے یہ سوچا کہ بنو قریظہ کے ہاں پہنچنے سے پہلے نماز کی ادائگی حضور ﷺ کے ارشاد کے منافی نہیں، جبکہ نماز ادا کرنے کی صورت میں ان کے وہاں پہنچنے میں تاخیر

۱۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی ۵: ۴۷

Marfat.com

بھی نہ ہوگی۔ یہاں دل چسپ بات یہ ہے کہ امام ابن قیمؒ نے إعلام الموقعین میں ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک کے مسلک کی درستگی کے بارے میں فقہا کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے: "بعض فقہا کے قول کے مطابق راستے میں نماز ادا کرنے والوں کا عمل افضل ہے، اس لیے کہ انہوں نے نماز اپنے وقت میں ادا کرنے اور حضور ﷺ کے حکم کی پیروی کرنے کی دونوں فضیلتیں حاصل کر لیں، جبکہ کچھ دیگر فقہا کے نزدیک بنو قریظہ کے ہاں پہنچنے تک نماز کو مؤخر کرنے والوں کا عمل افضل ہے..." یعنی فرق غلط اور صحیح کا نہیں، بلکہ افضل اور غیر افضل کا ہے۔

ہمارے خیال میں جب حضور ﷺ نے کسی فریق کو سرزنش نہیں کی تو فقہا (رحمہم اللہ) کو چاہیے تھا کہ وہ اسی پر اکتفا کر لیتے، اور ایسی چیز کے بارے میں بحث مباحثے سے پرہیز کرتے، جس کا فیصلہ خود حضور ﷺ نے فرما دیا تھا۔

۲۔ اس کی دوسری مثال وہ حدیث ہے جسے ابو داؤد اور حاکم نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "غزوہ ذات السلاسل کے دوران جاڑے کی ایک رات میں مجھے احتلام ہو گیا، مجھے خدشہ ہوا کہ اگر میں نے غسل کیا تو کہیں میری موت واقع نہ ہو جائے، اس لیے میں نے تیمم کیا اور اپنے ساتھیوں کی نماز فجر میں امامت کی، انہوں نے حضور ﷺ سے اس واقعے کا ذکر کر دیا۔ حضور ﷺ نے پوچھا: "اے عمرو، تو نے احتلام کی حالت میں امامت کی؟" میں نے اپنے غسل نہ کر سکنے کی وجہ بھی حضور ﷺ کے سامنے بیان کر دی اور یہ آیت پڑھی: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا

Marfat.com

أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾ [النساء۴: ۲۹] (اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، بلاشبہہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے)۔ اس پر حضور ﷺ مسکرا دیے اور کچھ نہیں کہا۔[1]

گویا متذکرہ عذر کے ساتھ تیمم کرنے اور تیمم کے ساتھ جماعت کرا دینے کے فعل کو سند مل گئی۔

تأویل اور اس کی قسمیں

عہد نبوی اور اس کے بعد صحابہؓ میں واقع ہونے والے سارے اختلافات کا بیان یہاں مقصود نہیں۔ بسا اوقات بعض صحابہؓ نے الفاظِ عبارت کے بالکل ظاہری معنیٰ مراد لیے اور کچھ نے اس سلسلہ کلام یا مروجہ محاورے یا شریعت کی مجموعی فضا کے لحاظ سے معانی استنباط کیے۔ یہ ایک لمبی بحث ہے جس کے لیے کئی جلدیں درکار ہیں۔ یہ مختصر سا مقالہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ بہر حال صحابہؓ نے ان واقعات سے یہ بات ذہن نشین کر لی تھی کہ دین میں آسانی رکھی گئی ہے اور شریعت میں کسی نص سے حکم کے استنباط کے لیے اختلاف رائے کی گنجائش موجود ہے۔

اب یہ ماہر مجتہدین اور فقہا کا کام ہے کہ شریعت کے کلیات و قواعد اور اس کے مقاصد تک لے جانے والے احکام بیان کریں۔ یہ مقصد کبھی ظاہر لفظ کو جوں کا توں لینے سے حاصل ہوتا ہے اور کبھی اس ظاہر لفظ کے پیچھے پوشیدہ معنیٰ اور علت کے استنباط سے، جسے "تأویل" کا نام دیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر روشنی ڈالنا فائدے سے خالی نہ ہوگا، لہٰذا ذیل میں تأویل کی اقسام اور اس کے قواعد و ضوابط کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ سنن ابوداؤد، باب إذا خاف الجنب البرد، حدیث ۳۳۴

Marfat.com

۱۔ قریبی تاویل

جسے معمولی غور و فکر سے معلوم کیا جاسکتا ہو اور وہ عبارت اس کا امکان اور گنجائش بھی رکھتی ہو، جیسے یتیم کا مال بطور صدقہ دینے، یا کسی اور کو بلاعوض دینے، یا اسے ضائع کرنے کو آگ کھانے کے مترادف قرار دے کر اسے اس قرآنی آیت کی رو سے حرام ٹھہرایا جائے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا﴾ [النساء۴: ۱۰] (جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں در حقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے)۔

دوسری مثال: کسی برتن میں پیشاب کرکے اسے ٹھہرے ہوئے پانی میں ڈال دینا، اس کو ایسے پانی میں براہ راست پیشاب کرنے کے برابر قرار دے کر اس حدیث کا مصداق ٹھہرانا جس میں پیشاب کرنے سے ممانعت وارد ہوئی ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: "تم میں سے کوئی شخص ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرے جس سے اس نے بعد میں نہانا ہے۔"[1] اس لیے کہ دونوں فعل پانی کی گندگی کا سبب بنتے ہیں۔

۲۔ دور کی تاویل

جسے معلوم کرنے اور اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے زیادہ غور و فکر درکار ہو اور لفظ میں اس کی گنجائش ہو۔ جیسے حضرت ابن عباسؓ نے حمل کی کم از کم مدت مندرجہ ذیل قرآنی آیات سے چھ مہینے اخذ کی: ﴿وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا﴾ [الاحقاف۴۶: ۱۵] (اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے)۔ اور دوسری

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب النهي عن البول في الماء الراكد، حدیث ۲۲۸

Marfat.com

آیت میں ہے: ﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ [البقرۃ۲: ۲۳۳] (جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدتِ رضاعت تک دودھ پیے تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں)۔ (دو سال مدت رضاعت اور کم از کم چھ مہینے مدتِ حمل)۔ یا جیسا کہ امام شافعیؒ نے اجماع کی حجیت پر اس قرآنی آیت سے استدلال کیا: ﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾ [النساء۴: ۱۱۵] (جو شخص رسول ﷺ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو اور اہلِ ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، جبکہ اس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہو، تو ہم اس کو اسی طرف چلائیں گے، جدھر وہ خود پھر گیا۔ اور اسے جہنم میں جھونک دیں گے۔ جو بدترین جائے قرار ہے)۔

اسی طرح اصولیین نے قرآنی آیت: ﴿فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ﴾ [الحشر۵۹: ۲] (عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو) سے قیاس کی حجیت اور اس کے شرعی دلیل ہونے پر استدلال کیا ہے۔ اس طرح کے نتائج اخذ کرنا اگرچہ بظاہر آسان نظر آتا ہے، مگر ان تک رسائی اس وقت تک مشکل ہے جب تک انسان کی سوچ وسیع اور نظر گہری نہ ہو، پھر اس کے لیے غور و فکر اور تدبر کے ملکہ کی بھی ضرورت ہے جو عام لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا۔

۳۔ دور از کار تاویل

جس کی گنجائش لفظ کے اندر موجود نہ ہو، اور تاویل کرنے والے کے پاس کسی قسم کی کوئی دلیل بھی نہ ہو، جیسے کسی نے اس آیت: ﴿وَعَلَامَاتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ﴾ [النحل۱۶: ۱۶] (اس نے زمین میں راستہ بنانے والی علامتیں رکھ دیں اور ستاروں سے بھی لوگ

Marfat.com

ہدایت پاتے ہیں) کی تفسیر یہ بیان کی ہے کہ "نجم" رسول اللہ ہے اور "علامات" ائمہ ہیں۔ یا جیسے کسی نے اس آیت: ﴿وَمَا تُغْنِي الْآيَاتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ [یونس ۱۰: ۱۰۱] (جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں) سے یہ مفہوم نکالا ہے کہ "آیات" سے مراد ائمہ ہیں اور نُذُر سے انبیا۔ یا جیسے کسی نے ﴿عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ. عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ﴾ [النبا ۷۸: ۱- ۲] (یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ کیا اس بڑی چیز کے بارے میں...) النَّبَإِ الْعَظِيمِ سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات لی ہے۔[1]

تأویل کے قواعد و ضوابط

اب تک جو گفتگو ہوئی ہے، اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تأویل کے لیے غور و فکر کے علاوہ کسی دلیل (یا گنجائش اور امکان) اور ضرورت کی موجودگی بھی ضروری ہے، بصورتِ دیگر نصوص کے ظاہری معنٰی کو اخذ کر لینا محفوظ طریقہ ہے۔ تأویل کی طرف صرف اجتہادی امور کی صورت میں رجوع کیا جائے۔ رہے اعتقادی مسائل تو ان میں اجتہاد کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں، ان میں نصوص کے ظاہری معنٰی کو لینا اور حقیقی معانی اور کیفیات کو اللہ کے سپرد کر دینا محفوظ راستہ ہے اور سلف صالحین کا بھی یہی موقف رہا ہے۔

تأویل ناگزیر ہو جانے کی صورت میں نص کو سمجھنا، اس کا تجزیہ کرنا، اور لغوی لحاظ سے ساری وجوہ کا احاطہ کرنا ضروری ہے (جو مقاصدِ شریعت اور عام شرعی کلیات اور قواعد و ضوابط کے مطابق بھی ہوں) اسی لیے کسی مسئلے میں نص کے ظاہری معنی

۱۔ أصول الكافي ۱: ۲۱۶

Marfat.com

کے مطابق حکم بیان کرنا یا دلالت کی مختلف وجوہ معلوم کرنے کے لیے نص کا تجزیہ کرنا فقہی اجتہاد اور شرعی اعتبار و قیاس کی ایک اہم قسم ہے، جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے: ﴿فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ﴾ [الحشر۵۹: ۲] (عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو!)۔

حضرت ابن عباسؓ نے تفسیر کے قواعد و ضوابط بیان کرتے ہوئے تفسیر کی چار اقسام بیان کی ہیں:

۱۔ ایک قسم ایسی ہے جو عربوں کے ہاں ان کے کلام میں معروف ہے۔

۲۔ دوسری قسم وہ ہے جس کے نہ جاننے میں کسی کا عذر قابلِ قبول نہیں ہے (یعنی جو ہر ایک کو معلوم ہونی چاہیے)۔

۳۔ تیسری قسم جسے صرف علما جانتے ہیں۔

۴۔ چوتھی قسم جسے صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

اس بنا پر تاویل اور تفسیر کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ شارع نے کئی مقامات پر ان میں سے ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ﴾ [آل عمران۳: ۷] (ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ان پر ایمان ہے)۔

مفسرین کی اکثریت نے یہاں "تاَویل" سے تفسیر اور بیان مراد لیا ہے۔ طبریؒ بھی ان میں شامل ہیں، جنہوں نے حضرت ابن عباسؓ اور دیگر حضرات سے اس کے یہی معنیٰ نقل کیے ہیں۔

Marfat.com

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ابن عباسؓ کے لیے جو دعا فرمائی اس میں فرمایا: اللهم فقّهه في الدين، وعلّمه التأويل (اے اللہ، اسے دین کی سمجھ اور (قرآن کی) تفسیر کا علم عطا فرما)۔ یہاں بھی تأویل کا لفظ تفسیر اور بیان کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

کچھ علما نے تفسیر کو تاویل کے مقابلے میں زیادہ "عام" شمار کیا ہے۔ جیسا کہ المفردات کے مؤلف راغب اصفہانی کا خیال ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ تفسیر کا لفظ زیادہ تر الفاظ کے بیان اور شرح کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ تاویل زیادہ تر معانی اور جملوں کے بیان کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تأویل کا لفظ عام طور پر کتاب و سنت کی نصوص سے معانی کے استنباط کے لیے بولا جاتا ہے۔ جبکہ تفسیر کتاب و سنت کی کسی نص سے معانی کے استنباط کے لیے بولا جاتا ہے۔

کتاب اللہ اور سنتِ رسول میں استعمال کے لحاظ سے ان دونوں اصطلاحات کے درمیان پائے جانے والے گہرے تعلق کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "تأویل" کے قواعد و ضوابط بھی وہی ہیں جو ماہرینِ فن نے تفسیر کے لیے مقرر کیے ہیں۔

اس بات میں شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ کتاب اللہ میں چند ایسی چیزیں بھی ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے جیسے اسما اور صفاتِ خداوندی کی اصل حقیقت کا علم اور امورِ غیبیہ کی تفصیلات وغیرہ۔ اسی طرح کچھ ایسے امور بھی ہیں جن کا علم صرف نبی ﷺ کو دیا گیا ہے اور کوئی شخص ایسی چیزوں کی تفسیر یا تاویل بیان کرنے کا مجاز نہیں۔

Marfat.com

ہر شخص پر فرض ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کی متعین کردہ حدود کا پابند رہے اور ان سے تجاوز نہ کرے۔

ان دو اقسام کے علاوہ ایک تیسری قسم بھی ہے، اور یہ ایسے علوم ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو تعلیم دی، جو قرآن میں موجود ہیں اور حضور ﷺ کو حکم دیا کہ لوگوں کو ایسے علوم سکھائیں۔ اور انہیں بیان کریں۔ ایسے علوم کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ وہ امور جن میں بحث و تمحیص کی گنجائش نہ ہو، بلکہ صرف منقول و منصوص چیزوں پر اکتفا کیا جاتا ہے، جیسے قرآن کے اسبابِ نزول اور ناسخ و منسوخ وغیرہ۔

۲۔ ایسے امور جو استدلال اور غور و فکر کے ذریعے معلوم کیے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں بھی علماے حق کے دو موقف ہیں:

الف۔ ان امور کی پہلی قسم وہ ہے جس کی تاویل کے جواز یا عدم جواز کے بارے میں ان کا آپس میں اختلاف ہے۔ جیسے اسما اور صفاتِ الٰہی سے متعلق آیات۔ اس کے بارے میں سلف کا طریقہ یہ ہے کہ یہاں تاویل ناجائز ہے اور درست مذہب بھی یہی ہے۔

ب۔ دوسری قسم (جس کے جائز ہونے پر علما کا اتفاق ہے) یہ ہے کہ تفصیلی دلائل سے شرعی احکام مستنبط کیے جائیں۔ اس کا نام "فقہ" ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ علما نے تاویل اور تفسیر کی کچھ شرائط بھی مقرر کی ہیں، جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

ا۔ تاویل، لغوی قواعد اور الفاظ کے استعمال میں عربوں کے عرفِ عام کی روشنی میں سمجھ میں آنے والے ظاہری معنی کو ختم نہ کر دے۔

Marfat.com

۲۔ کسی صریح نصِ قرآنی کے خلاف نہ ہو۔

۳۔ علما اور ائمہ کے درمیان کسی متفق علیہ شرعی قاعدہ کے خلاف نہ ہو۔

۴۔ شانِ نزول کے لحاظ سے نص جس مقصد کے لیے وارد ہوئی ہو، اس کا لحاظ رکھا جائے۔

جہاں تک باطل یا قابلِ ترک تاویل کی اقسام کا تعلق ہے، تو انہیں مندرجہ ذیل چند اقسام میں بیان کیا جاسکتا ہے:

ا۔ تاَویل اور تفسیر کسی ایسے شخص سے صادر ہوئی ہوں جو ان کا اہل نہ ہو، جس کے پاس لغوی، نحوی اور تاویل کے لیے ضروری دیگر شرائط کا خاطر خواہ علم نہ ہو۔

۲۔ متشابہات کی کسی صحیح سند کے بغیر تاویل کرنا۔

۳۔ ایسی تاَویلات جو کتاب و سنت کے واضح معانی یا اجماعِ امت کے منافی باطل آرا کو سند جواز فراہم کرتی ہوں۔

۴۔ تاَویل کے ساتھ قطعیت سے (بغیر دلیل لائے) یہ کہنا کہ شارع کی یہی مراد ہے۔

۵۔ ایسی تاَویل جس کی بنیاد خواہش نفس پر ہو، جیسے باطنیہ وغیرہ (فرقوں) کی تاَویلات۔

یہ تمام قابلِ رد تاَویلات "تاَویل مستبعد" (دور از کار تاَویل) کے زمرے میں آتی ہیں جس کا ذکر ہم پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں۔

Marfat.com

اہل اجتہاد صحابہ کرامؓ

اجتہاد کی اہمیت اور نزاکت اور اس پر مرتب ہونے والے اثرات کے پیش نظر اس جولان گاہ میں وہی صحابہ کرام اترے جو اس کی صلاحیت و قدرت سے بہرور تھے۔ اس لیے جب ایسی صلاحیت نہ رکھنے والا کوئی شخص اجتہاد کر کے غلطی کر بیٹھتا تو رسول اکرم ﷺ ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے اور اس کی منظوری نہ دیتے۔

ابو داؤد وغیرہ نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں:

ہم ایک مرتبہ سفر پر تھے کہ ہمارے ایک ساتھی کے سر پر پتھر آلگا اور اسے احتلام بھی ہو گیا تھا، اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ کیا میں تیمم کر سکتا ہوں؟ جواب میں انہوں نے اسے بتایا کہ آپ چونکہ پانی استعمال کرنے پر قادر ہیں، لہٰذا تیمم کرنے کی اجازت نہیں، چنانچہ اس نے غسل کیا جس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ ہم جب رسول اللہ ﷺ کے حضور میں واپس پہنچے اور انہیں اس واقعہ کے متعلق خبر دی تو آپ ﷺ نے فرمایا "انہوں نے اسے مار ڈالا۔ خدا انہیں ہلاک کرے! جب انہیں مسئلے کا پتا نہیں تھا تو کسی (اہل علم) سے کیوں نہیں پوچھا۔ اس لیے کہ بے علم شخص کا علاج پوچھنا ہی ہے۔ اس کے لیے تیمم کر لینا کافی تھا۔ وہ اپنے زخم پر پٹی باندھ کر اس پر مسح کر لیتا، اور باقی بدن کو دھو لیتا۔[1]

۱۔ سنن ابو داؤد، کتاب الطهارة، باب في المجروح تيمم، حديث ۳۳۶؛ ابن ماجه، أبواب التيمم، حديث ۵۷۲

Marfat.com

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتویٰ دینے والے اصحاب کے عذر کو قابل قبول نہیں سمجھا بلکہ ان سے سختی سے پیش آئے اور بلا علم فتویٰ دینے کی مذمت کی اور انہیں اپنے بھائی کا قاتل ٹھہرایا؛ اور وضاحت سے فرمادیا کہ جہالت ولاعلمی کی صورت میں انسان کو اہل علم سے پوچھنا چاہیے؛ لاعلمی کی صورت میں فتویٰ میں جلد بازی سے گریز کرنا چاہیے۔ اس بات کی طرف قرآن کریم نے بھی اشارہ دیا ہے: ﴿فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ [النحل۱۶: ۴۳] (اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم خود نہیں جانتے)۔

امام احمد، بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی اور طبرانی نے اسامہ بن زید سے روایت بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ایک سریّہ (جنگ) میں بھیجا، جب ہم بنو جُہینیہ کے علاقے "حرقات" میں پہنچے تو صبح کا وقت تھا۔ میں نے وہاں پر موجود ایک آدمی کو پکڑ کر گرالیا تو اس نے کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ پڑھا، مگر میں نے اس کے باوجود اسے نیزا مارا (جس سے اس کی ہلاکت ہوگئی) میرے دل میں اس کے متعلق خلش سی پیدا ہوئی، جس کا ذکر میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ آپؐ نے فرمایا: "کیا لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کے باوجود تم نے اسے قتل کر ڈالا؟" میں نے عرض کیا: یارسول اللہ، اس نے محض ڈر کے مارے کلمہ پڑھا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا تم نے اس کا دل چیر کر یہ معلوم کرلیا تھا کہ اس نے محض ڈر کے مارے ایسا کہا ہے؟ قیامت کے دن اس کے کلمہ لا الہ الا اللہ سے تمہیں کون چھڑائے گا؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار یہ بات دہراتے رہے، یہاں تک کہ میرے دل میں یہ تمنا

Marfat.com

پیدا ہوئی کہ کاش میں آج سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا[1]۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ ایسی صورت میں انہیں آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی سے دوچار نہ ہونا پڑتا [اور اسلام قبول کرنے سے پہلے کیے گئے ایسے گناہ کی معافی یقینی ہو جاتی ہے]۔

پہلی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے اس استدلال کو درست قرار نہیں دیا جس کے مطابق انہوں نے عام دلائل کی روشنی میں پانی کی موجودگی کی صورت میں اسی کے استعمال کو ضروری قرار دیا۔ چاہے پانی استعمال کرنے والے شخص کے حالات کچھ بھی ہوں۔ ان کا ذہن اس آیت کی طرف متوجہ نہ ہو سکا:

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ [المائدہ۵: ۶] (اگر تم بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے اپنی عورت سے مباشرت کی ہو اور پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کر لو)۔

پھر انہوں نے کسی اہل علم سے سوال بھی نہیں کیا، حالانکہ وہ اہلِ اجتہاد بھی نہ تھے۔

رہی حدیثِ اسامہ رضی اللہ عنہ، تو شاید انہوں نے آیت کریمہ: ﴿فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا﴾ [المومنین۴۰: ۸۵] (مگر ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان ان کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکتا تھا) سے یہ مفہوم نکالا ہو کہ موت کو سامنے دیکھ کر ایمان قبول کرنا جس طرح آخرت میں کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا اسی طرح دنیا میں بھی سود مند نہیں ہو گا۔ (جیسا کہ آیت کریمہ کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے اور اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں سرزنش کی)۔

۱۔ یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ روایت ہوئی ہے، دیکھیے: صحیح بخاری، کتاب الإیمان، حدیث۱۵۸

Marfat.com

صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ کے یہ چند نمونے ایسے ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتفاق نہیں فرمایا۔[1]

اکثر لوگ آپ ﷺ سے اپنی روزمرہ زندگی میں پیش آمدہ مسائل و واقعات کے بارے میں استفسار کرتے جن کے متعلق حضور ﷺ انہیں جواب مرحمت فرماتے۔ نیز ان کے درمیان تنازعات کے فیصلے فرماتے۔[2] ان کے درست کام دیکھ کر پسند فرماتے اور کرنے والے کی تعریف کرتے، خلافِ شرع کام کو ناپسند فرماتے۔ صحابہ کرامؓ ان تمام چیزوں کو سیکھتے، انہیں آگے بیان کرتے جس سے لوگوں میں ان کا چرچا ہوتا۔ کبھی ان کا آپس میں اختلاف بھی ہو جاتا۔ اور ایسی صورت میں وہ اختلافی مسائل کے بارے میں اپنی آرا پیش کرتے اور اس سے ان کا مطمحِ نظر حق کی تلاش ہوتا، نہ کہ خواہ مخواہ تنازع اور اختلاف برائے اختلاف، وہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے اور الزامات کے تبادلے سے بھی گریز کیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ کتاب و سنت کو وہ اپنا مرجع مان کر تمام اختلافات کو اس کی روشنی میں حل کر دیتے تھے کوئی ایسی چیز باقی نہ رہنے دیتے جو ان کی اخوت و محبت کو متاثر کرتی۔

اختلاف برائے اختلاف سے پرہیز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اس امت کی بقا اس پر موقوف ہے کہ جو دل اللہ کی محبت میں اکٹھے ہوئے ہیں، ان کی آپس میں الفت و محبت قائم و دائم رہے۔ کیونکہ اگر ایک مرتبہ دلوں میں دوری اور کدورت پیدا ہو گئی تو یہ چیز امت کی

۱۔ ابن حزم نے ایسے کئی فتاویٰ جمع کیے ہیں جنہیں رسول اکرم ﷺ نے قبول نہیں کیا، دیکھیں: الاحکام ۶: ۸۵-۸۷، ۲: ۱۲۶-۱۲۷

۲۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ ۱: ۲۹۸

Marfat.com

تباہی و بربادی پر منتج ہو گی۔ اسی لیے آپ صحابہ کرامؓ کو اختلاف برائے اختلاف سے باز رہنے کی تلقین فرماتے اور فرماتے تھے: لا تختلفوا فتختلف قلوبكم[1] یعنی اختلاف برائے اختلاف سے بچو، ورنہ تمہارے دل بھی اختلاف و منافرت کا شکار ہو جائیں گے۔

صحابہ کرامؓ بھی یہ بات خوب جانتے تھے کہ اختلاف برائے اختلاف کا نتیجہ کبھی بھی بہتر نہیں ہوتا، بلکہ اس کا نتیجہ ہمیشہ شر ہی کی صورت برآمد ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں: الخلاف شرٌّ (اختلاف شر ہی ہے)۔

حضور اکرم ﷺ اختلاف کی بیخ کنی اس کے پر پرزے نکالنے سے پہلے ہی فرما دیتے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں ایک دن دوپہر کے وقت آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کو دو اشخاص کی آواز سنائی دی جو ایک دوسرے سے ایک آیت کے بارے میں اختلاف کر رہے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غصے میں باہر تشریف لائے اور فرمایا:

إنما هلك مَن كان قبلكم باختلافهم في الكتاب (تم سے پہلے کی امتیں کتاب اللہ میں اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک و برباد ہوئی تھیں)۔[2]

نزال بن سبرہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا:

میں نے ایک شخص کو ایک آیت اس طریقے کے خلاف پڑھتے سنا جس طریقے سے میں نے یہ آیت آپؐ سے سنی تھی، میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور رسول اللہ

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ، باب تسویۃ الصفوف، حدیث ۴۲۳

۲۔ دیکھیے: ابن حزم، الإحكام في أصول الأحكام ۵: ۶۶

Marfat.com

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آیا تو آپؐ نے فرمایا: دونوں کی قراءت درست ہے۔" شعبہ (راوی) کہتے ہیں کہ آپؐ نے غالباً یہ بھی فرمایا: "آپس میں اختلاف سے بچو، کیونکہ سابقہ امتیں آپس میں اختلاف کی وجہ سے ہی ہلاک ہوئیں۔[1]

اس طرح آپؐ نے صحابہ کرام کو اور بعد میں آنے والی نسلوں کو اختلاف برائے اختلاف کے نتائج سے آگاہ فرما کر اس سے دور رہنے کی تلقین کی۔ صحابہ کرامؓ کو آپؐ نے قرآن کریم کی قراءت کے بارے میں اختلاف کے آداب کے متعلق خاص تلقین فرمائی ہے، آپ کا ارشاد گرامی ہے:

اقرءُوا القرآن ما ائتلفت علیه قلوبکم، فإذا اختلفتم فقوموا (جب تک تمہارے دل آپس میں ملے رہیں، اس وقت تک قرآن کی تلاوت کرو، اور جب اس میں تمہارے درمیان اختلاف ہو جائے تو اٹھ کھڑے ہو جاؤ)۔[2]

آپؐ نے اپنے اس فرمان کے ذریعے لوگوں کو قراءت یا قرآنی آیات کے معانی و مفہوم کے بارے میں اختلاف کی صورت میں قرآن مجید سے اس وقت تک دور رہنے کی تلقین فرمائی جب تک کہ دل کے جذبات و احساسات پر سکون نہ ہو جائیں، اور باہمی بحث و مباحثہ میں تُندی اور تُرشی کے جذبات و محرکات ختم نہ ہو جائیں جن کی وجہ سے

۱۔ ایضاً، صحیح بخاری، کتاب الخصومات، باب۱، حدیث ۲۴۱۰؛ صحیح مسلم، کتاب العلم، باب النهي عن اتّباع متشابِه القرآن، والتحذير من متبعيه، والنهي عن الاختلاف في القرآن، حدیث ۲۷۷۶

۲۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب۳۷، حدیث۵۰۶۱؛ صحیح مسلم، کتاب العلم، حدیث ۶۷۷۷

Marfat.com

تنازعے اور ضد کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مگر جب دل پر سکون ہو جائیں اور ان پر افہام و تفہیم کے جذبے کی گرفت مضبوط ہو جائے تو پھر کتاب اللہ کی آیات کی قراءت اور ان میں غور و فکر کا آغاز کیا جائے۔

صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلاف رونما ہونے کی صورت میں بسا اوقات قرآن کریم بھی آدابِ اختلاف کے متعلق ان کی رہنمائی کرتا۔ اس سلسلے میں حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے:

بنو تمیم کے وفد کے موقع پر جب دو حضرات (ابو بکرؓ و عمرؓ) میں اختلاف رائے کی وجہ سے ان کی آوازیں بلند ہو گئیں، تو ان کی ہلاکت کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ ان میں سے ایک (حضرت ابو بکرؓ نے اقرع بن حابس اور دوسرے (حضرت عمرؓ) نے قعقاع بن معید بن زرارہ کو امیر مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ اس پر حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ نے صرف میری مخالفت میں ایسی رائے دی ہے۔ عمرؓ نے کہا کہ میرا مخالفت کا قطعی ارادہ نہیں تھا۔ اس گفتگو میں ان کی آوازیں اونچی ہو گئیں جس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ [الحجرات۴۹: ۲] (اے ایمان والو، اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو)۔

حضرت عبد اللہ بن زبیر کہتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد حضرت عمرؓ کی آواز اتنی پست رہتی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو ان سے دوبارہ پوچھنا پڑتا تھا۔[1]

۱۔ فتح الباري ۸: ۱۶۶ اور ۴۵۴؛ ۱۳: ۲۳۵

Marfat.com

عہدِ نبویؐ میں آدابِ اختلاف کے چند نقوش

عہدِ نبویؐ میں آدابِ اختلاف کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ صحابہ کرامؓ کی حتی الوسع یہ کوشش ہوتی تھی کہ اختلاف پیدا نہ ہو۔ اس لیے وہ فرضی مسائل اور جزئیات نکالنے سے بالعموم گریز کیا کرتے تھے۔[1] اور صرف پیش آمدہ واقعات کا سنت نبوی کی روشنی میں حل بتاتے تھے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر پیش آمدہ واقعے کے حل پر اکتفا کیا جائے تو ایسی صورت میں بحث مباحثے کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے، چہ جائیکہ تنازعے اور عناد کی صورتیں پیدا ہوں۔

۲۔ اختلاف سے بچنے کی تمام تدابیر اختیار کرنے کے باوجود اگر اختلاف واقع ہو جاتا تو مختلف فیہ معاملے کا فوراً کتاب اللہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی روشنی میں جائزہ لیتے۔ نتیجۃً وہ اختلاف فوراً دور ہو جاتا۔

۳۔ کسی معاملے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم معلوم ہو جانے کے بعد وہ فوراً سر تسلیم خم کر دیتے۔ اس کی پابندی کرنا ان کا شیوہ تھا۔

۴۔ جو امور تاویل کے متحمل ہوتے، ان میں صحابہ کرام کے مابین اختلافِ رائے کی صورت میں حضور ﷺ ان کی راہنمائی فرماتے۔ پھر اختلاف رائے کی صورت میں ہر فریق کو یہ احساس بھی رہتا کہ اس کے دوسرے بھائی کی رائے میں بھی اسی طرح درستگی کا امکان موجود ہے جتنا اس کے اپنے خیال کے مطابق اس کی اپنی رائے میں ہے۔ یہ احساس بذات خود اس بات کا ضامن تھا کہ ایک دوسرے کے احترام پر کوئی آنچ نہ آنے دی جائے اور کسی رائے کے رد یا قبول کے بارے میں بے جا اصرار نہ کیا جائے۔

۱۔ فتح الباري ۱۳: ۲۱۹- ۲۲۸

Marfat.com

۵۔ وہ تقویٰ کا دامن تھامے رہتے اور نفسانی خواہشات سے اجتناب کرتے، چنانچہ اختلاف کرنے والوں کا منتہاے مقصود صرف حقیقت تک رسائی ہی ہوتا۔ قطع نظر اس سے کہ کسی حقیقت کا اظہار اس کی اپنی زبان سے ہو رہا ہو یا اس کے بھائی کی زبان سے۔

۶۔ وہ اسلام کے عمومی آداب کی پابندی کرتے ہوئے دوران گفتگو اچھے الفاظ کا انتخاب کرتے، جارحانہ اور سخت طرز تکلم سے گریز کرتے، اور دوسرے کی بات بغور سنتے۔

۷۔ وہ خواہ مخواہ کے جھگڑے سے حتی الوسع پرہیز کرتے، زیر بحث موضوع کے بارے میں اپنی پوری کوشش صرف کرتے جس کی بنیاد پر ہر فریق دوسرے کی راے کو سنجیدگی سے سنتا اور اس کا پورا پورا احترام کرتا اور پھر یا تو اسے قبول کرنے پر مجبور ہوتا یا اس سے بہتر راے پیش کرنے کی کوشش کرتا۔

یہ وہ چند خاص آدابِ اختلاف ہیں جو عہد رسالت میں پیش آنے والے واقعات کے مطالعے سے سامنے آتے ہیں۔

عہدِ صحابہؓ میں اختلاف اور اس کے آداب

بعض مصنفین نے صحابہ کرامؓ کے کردار اور زندگی کی جس طرح منظر کشی کی کوشش کی ہے اس سے عام لوگوں نے ان کے بارے میں یہ تصور قائم کر لیا ہے کہ یہ لوگ اپنے اوصاف و کردار کے لحاظ سے کچھ اس طرح کے لوگ تھے کہ ان جیسے اوصاف و کردار کے حامل گروہ کا دوبارہ پیدا ہونا ناممکن ہے۔ دراصل ایسا تصور قائم کرنا نہ صرف روحِ اسلام کے منافی ہے بلکہ اس کو بنیاد بنا کر چند بے راہ رو لوگوں نے یہ

Marfat.com

تاثر دینا شروع کر دیا ہے کہ عہدِ صحابہؓ کے بعد قرآن و سنت کے سائے میں اسلامی زندگی گزارنے کے عہد کو واپس لانا محال ہے، لہٰذا اس کی کوشش ہی ترک کر دینی چاہیے۔ وہ اپنے اس رویے سے دلوں میں شریعت کے سائے میں زندگی گزارنے کی امید کی کرن کو بجھانا چاہتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ کی مثالی جماعت قرآن و سنت ہی کی وجہ سے وجود میں آئی اور ہدایت کے یہ دونوں سرچشمے ہمارے درمیان بھی موجود ہیں؛ اور یہ ہر زمان و مکان میں اسی طرح کی خداترس جماعت کو وجود میں لانے کی مکمل صلاحیت و طاقت رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ انہیں نظامِ زندگی کے طور پر اپنایا جائے اور ان کی مقرر کردہ راہوں کو اختیار کیا جائے۔ اور ان سے اسی طرح استفادہ کیا جائے جس طرح صحابہ کی جماعت نے کیا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اس زمانے میں اسی طرز کی جماعت کا عالم وجود میں آنا محال ہے، گویا کتاب اللہ اور سنت رسول کو ناقص قرار دینے کے مترادف ہے۔ یہ تاثر دینے کی کوشش کہ صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں ان دونوں کا انقلاب آفرین اثر مخصوص حالات کے تابع تھا اور عصر حاضر میں پیدا ہونے والے نئے تقاضوں اور نظاموں نے انہیں پیچھے چھوڑ دیا ہے (معاذ اللہ) نہ صرف یہ کہ باطل اور ناقابل قبول ہے بلکہ ایسا خیال رکھنے والا فرد یقینی طور پر صریح کفر و عصیان کا مرتکب ہو رہا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے درمیان بہت سے معاملات میں اختلاف رونما ہوتا تھا، جس کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ اپنی زندگی میں فرما دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب آپؐ کے دور میں اس طرح اختلاف ہو سکتا تھا تو بعد میں کیسے نہیں ہو سکتا تھا؟ اختلاف پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ اور وہ بجا طور پر کئی اسباب کی بنا پر ایک دوسرے سے اختلاف کرتے

Marfat.com

تھے لیکن اس کے آداب واصول کا بھی وہ پوری طرح لحاظ رکھتے تھے جیسا کہ پہلے بھی اس کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ آپ ﷺ کے وصال کے بعد ان کے درمیان واقع ہونے والے کچھ اہم اختلافی مسائل یہ ہیں:

ا۔ حضور اکرم ﷺ کے وصال کے بارے میں اختلاف

آپ ﷺ کے وصال کے بعد سب سے پہلا اختلاف آپ ﷺ کی وفات کی حقیقت کے سلسلے میں پیش آیا۔ سیدنا عمرؓ اس بات پر مصر تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات نہیں ہوئی اور یہ محض منافقین کی طرف سے پھیلائی ہوئی افواہ ہے حتیٰ کہ آپؓ نے انہیں اس پر دھمکیاں بھی دیں۔ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ تشریف لائے تو آپؓ نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللهُ الشَّاكِرِينَ﴾ [آل عمران۳: ۱۴۴] (محمد ﷺ، تو ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو الٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے وہ اس کی جزا دے گا)۔

اس کے بعد پھر انہوں نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی: ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾ [الزمر۳۹: ۳۰] (تمہیں بھی موت آئے گی اور انہیں بھی مرنا ہے)۔ یہ آیات کریمہ سنتے ہی حضرت عمرؓ کے ہاتھ سے تلوار گر گئی اور ساتھ ہی خود بھی زمین پر گر پڑے، اور انہیں آپ ﷺ کے وصال اور وحی کے انقطاع کا یقین ہو گیا۔ حضرت ابو بکرؓ کی تلاوت کردہ

Marfat.com

آیات کے متعلق وہ خود کہا کرتے تھے: بخدا، گویا کہ میں نے انہیں پہلے کبھی پڑھا ہی نہیں تھا۔

بعد میں اپنی خلافت کے دوران میں حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ کے ایک سوال کے جواب میں اپنے اس موقف کی یہ توجیہہ فرمائی کہ یہ غلط فہمی اس آیت کریمہ کی وجہ سے ہوئی تھی: ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ [البقرة۲: ۱۴۳] (اور اسی طرح ہم نے تم مسلمانوں کو امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ رہو اور رسول ﷺ تم پر گواہ ہوں)۔ چنانچہ میں جب بھی اس آیت کریمہ کی تلاوت کرتا اس سے میں یہی سمجھتا کہ حضور اکرم ﷺ اپنی امت کے درمیان میں ہمیشہ موجود رہیں گے تاکہ آخری زمانے تک اس کے اعمال پر شہادت دے سکیں۔ اسی بنا پر میں نے یہ بات کہی تھی۔

گویا کہ آپؓ نے ان آیات کے مفہوم کو سمجھنے میں اجتہاد سے کام لیا اور یہ سمجھا کہ اس سے مراد دنیا میں گواہی ہے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ امت کے آخری دور تک رسول اکرم ﷺ ان کے ساتھ رہیں۔

۲۔ تدفین رسول ﷺ کے بارے میں اختلاف

صحابہ کرامؓ کے مابین اس بارے میں بھی اختلاف واقع ہوا کہ آپ کو کہاں دفن کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ آپ کو مسجد نبوی میں دفن کیا جائے، کسی نے آپ ﷺ کو اصحابؓ کے ساتھ دفن کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "اللہ نے ہر نبی کی روح وہیں قبض کی ہے،

Marfat.com

جہاں وہ چاہتا ہے کہ اس کی تدفین ہو۔"[1] چنانچہ جس بستر پر آپ ﷺ کی وفات ہوئی تھی، اسے اٹھا کر وہیں زمین کھود کر آپ ﷺ کی قبر مبارک بنائی گئی۔

۳۔ خلافتِ رسول ﷺ پر اختلاف

اس بات پر بھی صحابہؓ کا آپس میں اختلاف واقع ہوا کہ خلافت مہاجرین کا حق ہے یا انصار کا؟ خلیفہ بس ایک ہو یا کئی ایک؟ اس اختلاف کو بھی انہوں نے آنحضور ﷺ کے اسوہ حسنہ اور اقوال کی روشنی میں نہایت عمدہ طریقے سے حل کر لیا جس کی تفصیل کتب سیرت میں موجود ہے۔

۴۔ مانعینِ زکاۃ سے جنگ کے بارے میں اختلاف

یہ چوتھا اہم معاملہ تھا جس کے بارے میں صحابہ کرامؓ کے مابین اختلاف واقع ہوا، جسے انہوں نے اپنی نیتوں کی سچائی اور اختلاف کے آداب پر سختی سے کاربند رہنے کی وجہ سے بحسن و خوبی حل کر لیا۔ حضرت ابو بکرؓ کی بیعت خلافت کے بعد بعض نو مسلم قبائل ارتداد کا راستہ اختیار کر کے مسیلمہ کذاب جیسے جھوٹے مدعیانِ نبوت کے پیروکار بن گئے تھے اور کچھ قبائل نے نماز اور زکاۃ سے اور بعض دیگر قبائل نے صرف زکاۃ دینے سے انکار کر دیا۔ دراصل ان لوگوں کا حضرت ابو بکرؓ کو زکاۃ نہ دینے کا سبب جاہلانہ تکبر و نخوت تھی۔ شیطان نے ان کے ذہن میں ایک غلط تاویل بھی ڈال دی کہ شرعی اصول کے مطابق زکاۃ رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی اور کو نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے کہ مندرجہ ذیل آیت میں زکاۃ لے کر ان کے تزکیہ و تطہیر اور ان کے لیے دعا کرنے کے حکم کے آپ ﷺ ہی مخاطب تھے:

۱۔ سنن ترمذی، أبواب الجنائز، باب ۳۳، حدیث ۱۰۱۸

Marfat.com

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ وَاللهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ [التوبۃ۹: ۱۰۳] (ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں صاف اور پاکیزہ کرو اور ان کے حق میں دعاے رحمت کرو؛ کیونکہ تمہاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہو گی۔ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے)۔

مانعینِ زکاۃ یہ بھول گئے یا انہوں نے اس بات سے تجاہل عارفانہ برتا کہ یہ خطاب صرف رسول اللہ ﷺ تک محدود نہیں بلکہ آپ کے بعد امور مملکت سنبھالنے والے ہر خلیفہ ونائب کے لیے بھی ہے۔ اس لیے کہ آپ ﷺ سے یہ خطاب اسلامی ریاست کے سربراہ اور مسلمانوں کے امام کی حیثیت سے تھا؛ اور زکاۃ وصول کرکے اس کے مستحقین تک پہنچانا معاشرے کو منظم کرنے اور اس کے انتظام کو چلانے کے سلسلے میں کیے جانے والے امور کا ایک حصہ ہے، جس کی ذمہ داری رسول اللہ ﷺ کے بعد مسلمانوں کے معاملات چلانے والے آپ ﷺ کے نائبین تک منتقل ہوتی رہے گی۔

رسول اللہ ﷺ سے بیعت کرنے والا ہر مسلمان نماز کی پابندی اور زکاۃ کی ادائگی کی بھی بیعت کرتا تھا۔ اس لیے دونوں فریقوں کے درمیان تفریق کا کوئی جواز نہیں تھا۔ خلیفہ اول کا موقف بھی یہی تھا۔ اس لیے انہوں نے مانعینِ زکاۃ سے جنگ کا فیصلہ کیا۔ تاکہ انہیں زکاۃ ادا کرنے اور توبہ کرکے دائرۂ اسلام میں واپس آکر حضور ﷺ سے کیے گئے عہد وپیمان کی پابندی پر آمادہ کیا جائے۔

خلیفہ اولؓ کے اختیار کردہ اس موقف پر ان کے اور حضرت عمرؓ کے درمیان اختلاف پیدا ہوا جن کی راے شروع میں ایسے لوگوں سے جنگ نہ کرنے کی تھی۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں: جب رسول اکرم ﷺ کا وصال ہوا اور حضرت ابو بکرؓ

Marfat.com

کے سامنے بعض قبائل عرب کے کفر و ارتداد کا مسئلہ پیش ہوا تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ جاری رکھوں جب تک کہ وہ کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار نہ کرلیں۔ پھر جس نے اس کلمہ کا اقرار کر لیا اس کی جان و مال امان میں ہے..." تو جب یہ لوگ کلمہ طیبہ کا اقرار کرنے کے بعد اپنی جان و مال کی امان پا چکے ہیں تو پھر آپ ان سے کیسے جنگ کر سکتے ہیں؟ حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا: "میں ہر اس شخص سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکاۃ کے درمیان تفریق کرے گا۔ اس لیے کہ زکاۃ مال کا حق ہے، بخدا اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی، جو وہ رسول اکرم ﷺ کو دیتے تھے روکیں گے تو میں ان سے جنگ کروں گا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ کا جنگ کے بارے میں شرحِ صدر دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہی حق اور صحیح راستہ ہے۔"

حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ نے حضرت ابو بکرؓ کی رائے سے اتفاق کر لیا۔ اس لیے کہ جس طرح نماز کا منکر دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اسی طرح زکاۃ کا منکر بھی مرتد ہو جاتا ہے جس سے جنگ واجب ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم کی کئی آیات اور احادیث مبارکہ میں نماز اور زکاۃ کا ایک دوسرے کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں کا حکم ایک ہے اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے اگر ایسا مضبوط موقف اختیار نہ کیا ہوتا تو شاید اسلام کی یہ قوت و شوکت نہ ہوتی اور وہ صرف مکہ و مدینہ تک محدود ہو کر رہ جاتا اور ارتداد وغیرہ کے فتنے پورے جزیرۂ عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔

Marfat.com

۵۔ بعض فقہی مسائل میں اختلاف

ان نازک معاملات کو چھوڑ کر جن کا فیصلہ ہو گیا تھا، اگر ہم دوسرے اختلافی مسائل کا جائزہ لیں تو آدابِ اختلاف اور علما کی طرف سے ایک دوسرے کی تعظیم و تکریم کے حیرت انگیز مناظر سامنے آتے ہیں۔ مندرجہ بالا اختلافی مسائل کے علاوہ جنگ میں مارے گئے مرتدین کی عورتوں کو قید کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کے درمیان مختلف فیہ تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کی رائے یہ تھی کہ انہیں گرفتار کر کے لونڈیاں بنایا جائے؛ جبکہ حضرت عمرؓ کی رائے اس کے برعکس تھی۔ جنہوں نے اپنے عہد خلافت میں حضرت ابو بکرؓ کے فیصلے کو توڑ کر انہیں آزاد قرار دے کر ان کے رشتہ داروں کے سپرد کر دیا۔ سوائے ان کے جن کے مالک سے کوئی اولاد ہو گئی ہو، جن میں محمد بن علیؓ کی والدہ خولہ بنتِ جعفر الحنفیہ شامل ہے۔

اسی طرح مفتوحہ اراضی کی تقسیم پر بھی ان کا آپس میں اختلاف تھا۔ حضرت ابو بکرؓ اسے مجاہدین میں تقسیم کرنے کے قائل تھے، جبکہ حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ وہ تمام مسلمانوں کے لیے وقف رہنی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اسے تقسیم نہیں کیا۔

عطیات میں کمی بیشی اور ترجیح کے مسئلے پر بھی ان کی رائے ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ حضرت ابو بکرؓ عطیات میں برابری اور مساوات کے قائل تھے؛ جبکہ حضرت عمرؓ ترجیح کے قائل تھے۔ چنانچہ انہوں نے عطیات میں مسلمانوں کے درمیان مختلف اسباب کی بنا پر کمی و بیشی کا لحاظ رکھا۔

حضرت عمرؓ نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا جبکہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ اسی طرح کئی اور فقہی مسائل میں ان کے درمیان

Marfat.com

اختلاف رائے موجود تھا؛ لیکن اس اختلاف کا نتیجہ باہمی محبت و تعلق میں اضافے کے سوا کچھ نہ نکلا، جس کا اظہار حضرت ابو بکرؓ کے اس قول سے ہوتا ہے جو انہوں نے اس شخص کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا، جس نے حضرت عمرؓ کی بطور خلیفہ نامزدگی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا: "آپ نے حضرت عمرؓ کو ہمارا خلیفہ نامزد کر دیا ہے اور آپ کو ان کی سختی کا بھی بخوبی علم ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر آپ سے اس کے متعلق سوال کرے گا تو آپ کیا جواب دیں گے؟" اس وقت آپ نے جواب میں فرمایا تھا: "میں کہوں گا، خدایا، تیرے سب سے اچھے بندے کو میں نے ان کا خلیفہ بنایا تھا۔"

دوسری طرف کسی نے حضرت فاروق اعظمؓ سے کہا کہ آپ حضرت ابو بکرؓ سے بہتر ہیں تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور کہا کہ بخدا ابو بکرؓ کی ایک رات عمر اور آل عمر سے بہتر ہے۔ شیخین کے اختلافات کی یہ ایک جھلک تھی۔ ان کے مابین آرا میں اختلاف تو واقع ہوا مگر دل ایک دوسرے سے جڑے رہے اور چونکہ انہیں آسمانی تعلق کی رسیوں نے جکڑ رکھا تھا اس لیے زمین کی مٹی کا ان پر بس نہ چل سکا۔

حضراتِ عمرؓ و علیؓ کے مابین اختلافِ رائے

حضرات عمر و علی رضی اللہ عنہما کے مابین بھی کچھ اختلافِ رائے تھا، لیکن ہمیشہ باہمی احترام و ادب ہی رہا۔ ایک واقعہ بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے اس اختلافِ رائے کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

ایک عورت کا شوہر لمبے سفر پر تھا اور اس کے ہاں لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ حضرت عمرؓ کو یہ بات ناگوار گزری، آپ نے اسے بلا بھیجا۔ قاصد نے جب اسے حضرت عمرؓ کے پاس چلنے کو کہا تو وہ لگی چیخنے چلانے کہ نہ جانے عمرؓ نے اسے کیوں بلایا

Marfat.com

ہے۔ بہر حال جب وہ گھر سے روانہ ہوئی تو خوف و گھبراہٹ کی وجہ سے راستے ہی میں اس کے دردِ زہ شروع ہو گیا۔ جس پر وہ ایک گھر میں داخل ہو گئی۔ جہاں اس نے ایک بچے کو جنم دیا۔ لڑکا دو چیخیں مار کر وہیں مر گیا۔ حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ طلب کیا۔ بعض نے کہا کہ آپ پر کچھ نہیں۔ تادیب کرنا اور نظام کو درست رکھنا بطور حکمران آپ کی ذمہ داری ہے، جبکہ حضرت علیؓ خاموش رہے۔ آپؓ نے حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا: "اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا: ان حضرات نے اگر اپنا صحیح خیال ظاہر کیا ہے تو ان کی رائے درست نہیں اور اگر آپ کی رضاجوئی کے لیے انہوں نے ایسا کیا ہے تو آپ سے خیر خواہی نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ اس بچے کا خون بہا آپ پر ہے، اس لیے کہ آپ ہی کی وجہ سے عورت نے خوفزدہ ہو کر (قبل از وقت) بچہ جن دیا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ بچے کی دیت ادا کرنے کی ذمہ داری آپ کی قوم پر تقسیم کر دی جائے۔[1]

حضرت عمرؓ نے امیر المؤمنین ہوتے ہوئے بھی حضرت علیؓ کی رائے کو اختیار کرنے اور ان کے اجتہاد پر عمل کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کی، جبکہ دوسرے صحابہؓ کی رائے پر عمل کر کے آپ ذمہ داری سے بری ہو سکتے تھے۔

۱۔ عبدالرزاق، المصنف ۹: ۴۵۸، ۴۵۹؛ ابن قدامہ، المغني، کتاب الدیات ۸: ۳۳۸

Marfat.com

خلافتِ راشدہ میں ادبِ اختلاف کے چند نقوش

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ صحابہ کرام میں قرآنی علوم اور سنتِ رسول ﷺ کا سب سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے آپ کو جو قربت حاصل تھی، اس کی بنیاد پر بہت سے صحابہ کرامؓ آپ کو رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت میں شمار کرتے تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں: "حضور اکرم ﷺ کے گھر بہت زیادہ آمد و رفت اور ان کے ساتھ قرب و تعلق کی وجہ سے ایک عرصہ تک ہم ابن مسعودؓ اور ان کی والدہ کو اہلِ بیت میں سے سمجھتے رہے۔"[1]

حضرت ابو مسعود بدریؓ نے ایک دفعہ حضرت ابن مسعودؓ کو آتے ہوئے دیکھا تو ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے: "میرے خیال میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیچھے ان سے بڑھ کر کتاب و سنت کا علم رکھنے والا کوئی نہیں چھوڑا۔ یہ سن کر ابو موسیٰ اشعریؓ نے کہا: آپ سچ کہتے ہیں، اس لیے کہ ہم جب غیر حاضر ہوتے تو یہ موجود رہتے۔ ہمیں جب روک دیا جاتا تب بھی انہیں اجازت ہوتی۔"[2]

حضرت عمرؓ کی جلالتِ شان اور فقہ میں مقام معروف و مسلم ہے۔ انہوں نے عبد اللہ بن مسعودؓ کو امورِ خلافت کی ادائگی میں اپنا معاون بنا رکھا تھا۔ بہت سے اجتہادی مسائل میں آپ کی راے حضرت عمرؓ کی راے کے اس قدر مطابق ہوتی کہ اسلامی قانون کے مؤرخین کا کہنا ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ میں سب سے زیادہ حضرت عمرؓ سے متأثر تھے۔ اکثر اوقات دونوں حضرات کا اجتہاد اور طریقہ استدلال تک یکساں

۱۔ صحیح مسلم، باب من فضائل عبد اللہ بن مسعود وأمه، حدیث ۶۴۸۰؛ ابن حزم، الإحکام ۶: ۶۳

۲۔ ایضاً

Marfat.com

ہوتا تھا۔ بعض فقہی مسائل میں آپ نے اپنے اجتہاد سے رجوع کر کے حضرت عمرؓ کے اجتہاد کو اختیار کر لیا تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دادا کی موجودگی میں بھائیوں کو میراث سے حصہ دینے کے مسئلے میں آپ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا۔ بھائی کے انتقال کی صورت میں جب اس کے ورثا دادا اور دوسرے بھائی ہوں تو امام ابو حنیفہؒ کی رائے کے مطابق ترکے کا مستحق صرف دادا ہو گا اس لیے کہ وہ باپ کا قائم مقام ہے اور بھائی محروم رہیں گے، جبکہ باقی تینوں مذاہب کے مطابق دادا اور بھائی دونوں وارث ہوں گے۔ کبھی دادا کو باقی بھائیوں کے برابر اور کبھی پورے مال کا تیسرا یا چھٹا حصہ دیا جائے گا۔ پہلی رائے حضرت ابو بکرؓ، ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ کی ہے، اور دوسری رائے کے قائل حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ ہیں۔ حضرت عمرؓ کی بھی یہی رائے ہے۔[1]

اس ذہنی ہم آہنگی کے باوجود بہت سے مسائل میں دونوں حضرات کا آپس میں اختلاف بھی تھا۔ جیسے حضرت ابن مسعودؓ رکوع میں اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں کے درمیان کر لیتے تھے اور گھٹنوں پر رکھنے سے منع فرماتے تھے، جبکہ حضرت عمرؓ کا عمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ گھٹنوں کے درمیان ہاتھ رکھنے سے منع فرماتے تھے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو کہے: أنتِ عليَّ حرام (تو مجھ پر حرام ہے) تو ابن مسعودؓ کی رائے کے مطابق یہ قسم ہے، جبکہ حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق یہ طلاق ہے۔ اگر کسی شخص نے کسی عورت سے بدکاری کی، پھر اس سے نکاح کر لیا تو حضرت ابن مسعودؓ

۱۔ الإحکام ۱: ۶

Marfat.com

کی رائے یہ تھی کہ وہ جب تک ساتھ رہیں زناکار ہیں؛ جبکہ حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق پہلے زنا اور بعد کا عمل نکاح شمار ہو گا۔[1]

ابن قیمؒ نے إعلام الموقّعین میں کہا ہے کہ حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ کے درمیان مختلف فیہ فقہی مسائل کی تعداد سو (۱۰۰) ہے۔ ان میں سے انہوں نے چار کا ذکر بھی کیا۔[2] یہ تمام تر اختلافات ان دونوں حضرات کے درمیان موجود باہمی محبت و احترام میں کسی قسم کی کمی کا باعث نہیں بنے۔

ایک بار حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ہاں دو آدمی آئے۔ ان میں سے ایک نے حضرت عمرؓ اور دوسرے نے کسی اور صحابیؓ سے قرآن پڑھا تھا۔ پہلے شخص نے کہا کہ مجھے حضرت عمرؓ نے اسی طرح پڑھایا ہے۔ یہ سن کر ابن مسعودؓ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے جن سے ان کے آگے پڑی ہوئی کنکریاں تک بھیگ گئیں اور کہا: "جس طرح عمرؓ نے تمہیں پڑھایا ہے اسی طرح پڑھو۔ بلا شبہہ وہ اسلام کا ایک مضبوط قلعہ تھے، جس میں لوگ داخل ہو کر باہر نہیں نکلتے تھے، آپ کے انتقال سے وہ قلعہ ٹوٹ گیا ہے۔[3]

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ ایک روز آئے اور حضرت عمرؓ تشریف فرما تھے۔ آپ کو آتے دیکھ کر حضرت عمرؓ نے فرمایا: "یہ تو علم و تفقہ سے بھرے ہوئے برتن کی طرح ہیں۔" ایک اور روایت میں ہے: "میں علم سے لب ریز اس شخصیت کو اہل

۱۔ ایضاً

۲۔ إعلام الموقعین ۲: ۲۱۸

۳۔ الإحکام ۶: ۶۱

Marfat.com

قادسیہ (عراق) کے لیے منتخب کرتا ہوں۔"[1] یہ تھا ابن مسعودؓ کے بارے میں حضرت عمرؓ کا نقطۂ نگاہ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے اختلافی مسائل انہیں ایک دوسرے کی نگاہ میں اور زیادہ قابلِ احترام بنا دیتے تھے۔ اس طرح کے واقعات ہمارے لیے اختلافی مسائل کے حل کے لیے رہنما اصول و آداب وضع کرنے میں مشعل راہ ثابت ہوسکتے ہیں۔

اختلافِ رائے کی مزید مثالیں

صحابہ کرامؓ نے جن آدابِ اختلاف کا مظاہرہ کیا، اس کے شواہد کے طور پر چند مزید اختلافی مسائل پیش کیے جارہے ہیں۔

جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ اور بہت سے دوسرے صحابہ کرامؓ کی طرح حضرت ابن عباسؓ کی رائے یہ تھی کہ باپ کی طرح دادا کی موجودگی میں بھی بھائی بہن وراثت سے محروم ہو جاتے ہیں جبکہ حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ اور کچھ دیگر صحابہؓ کے ساتھ حضرت زید بن ثابتؓ کی رائے یہ تھی کہ بھائی دادا کی موجودگی میں وراثت سے حصہ پائیں گے اور دادا انہیں محروم نہیں کر سکتا۔ اس پر حضرت ابن عباسؓ نے ایک روز کہا: کیا زید اللہ سے نہیں ڈرتے، پوتے کو تو بیٹے کا قائم مقام بنا دیا، مگر دادا کو باپ کا مقام نہیں بنا دیتے، پھر کہا: میں چاہتا ہوں کہ میراث کے اس مسئلے میں جو لوگ مجھ سے اختلاف کرتے ہیں وہ میرے ساتھ رکن بیت اللہ پر ہاتھ رکھ کر گڑگڑائیں اور کہیں کہ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہو.....[2]

۱۔ طبقات ابن سعد ۳: ۱۶۱؛ حیاۃ الصحابۃ ۲۵۷

۲۔ فخر الدین رازی، محمد بن عمر بن الحسین، المحصول (تحقیق: طہ جابر)، دارالسلام، قاہرہ ۲۰۱۱ء، ۳: ۱۱۸۱، حاشیہ ۶

Marfat.com

صحابہ کرامؓ کے فقہی اختلافات کے ذکر سے ہمارا مقصود یہ نہیں ہے کہ اختلاف کی بنیادوں کو تقویت پہنچائی یا اختلاف کو ہوا دی جائے، بلکہ اس سے مقصد صرف یہ ہے کہ اختلاف کے اصول و آداب کی متاعِ گم گشتہ کو پھر سے ذہن میں تازہ کر کے اس سے اپنے فقہی اختلافات کے حل میں مدد لی جائے اور اپنے معاملات کے لیے اسے اسلوبِ زندگی اور مشعل راہ بنایا جائے۔

حضرت ابن عباسؓ جنہیں اپنے مذکورہ اجتہاد کی اصابت اور حضرت زیدؓ کے اجتہاد کی غلطی پر اتنا وثوق تھا کہ وہ اس پر مباہلہ کرنے کے لیے بھی تیار تھے، ان کی خوبیٔ کردار کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک روز انہوں نے زید بن ثابتؓ کو کسی سواری پر تشریف فرما دیکھا تو احتراماً ان کی سواری کی رکاب ہاتھ میں لے لی اور ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ حضرت زیدؓ نے کہا: اے رسول اللہ ﷺ کے چچا کے فرزند، آپ ہٹ جائیں اور ایسا نہ کریں۔ ابن عباسؓ نے کہا: ہمیں یہی تعلیم دی گئی ہے کہ اپنے علما اور بڑوں کے ساتھ ایسا ہی کریں۔ زید بن ثابت نے کہا: لائیں اپنا ہاتھ میری طرف بڑھائیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے ہاتھ آگے کیا تو حضرت زیدؓ نے اسے چوم لیا اور کہا: ہمیں نبی کے اہل بیت کے ساتھ ایسا ہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔[1]

جب حضرت زیدؓ کا انتقال ہوا تو ابن عباسؓ نے کہا: هكذا يذهب العلم (علم اسی طرح رخصت ہو رہا ہے)[2] بیہقی کی روایت میں اس موقع پر ابن عباسؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے: "آج علم کا بہت بڑا حصہ دفن ہو گیا۔"[3]

١۔ كنز العمال ٧: ٣٧؛ حياة الصحابة ٢: ١٨

٢۔ إعلام الموقعين ١: ١٨

٣۔ بيهقي، السنن الكبرىٰ ٦: ٢١١

Marfat.com

صدرِ اسلام میں بڑے بڑے فتنوں نے سر اٹھایا اور صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلافات رونما ہوئے اور نوبت جنگوں تک پہنچ گئی (جس کے حقیقی اسباب اور وجوہات کا صحیح علم صرف اللہ ہی کے پاس ہے) مگر اس عالم میں بھی انہوں نے اہلِ فضیلت کے فضائل کو فراموش نہیں کیا اور ان عظیم حادثات اور فتنوں کے باوجود بزرگوں کے مناقب و مآثر ان کی نظروں سے کبھی بھی اوجھل نہ رہے۔

حضرت طلحہؓ جو جنگِ جمل میں شریک تھے، ان کے صاحب زادے عمران بن طلحہؓ جنگِ جمل کے بعد حضرت علیؓ کے پاس آئے تو حضرت علیؓ نے انہیں خوش آمدید کہا، انہیں اپنے پاس بٹھایا اور کہا: امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کے والد کو اس جماعت میں سے بنائے گا، جن کے بارے میں ارشاد ربانی ہے: ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ﴾ [الحجر۱۵: ۴۷] (ان کے دلوں میں جو کھوٹ کپٹ ہوگی اسے ہم نکال دیں گے، وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر (جنت میں) آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے)۔ اس کے بعد حضرت طلحہؓ کے گھر والوں کے بارے میں فرداً فرداً پوچھنے لگے۔ بھتیجے، بچے اور ان کی مائیں کیسی ہیں؟ فلاں کا کیا حال ہے؟ فلاں کس طرح ہے؟

یہ دیکھ کر کچھ لوگوں کو جنہیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل نہیں ہوسکا تھا، اور ان کے لیے صحابیت کی عظمت و شرف کا اندازہ لگانا مشکل تھا، تعجب ہوا اور کنارے پر بیٹھے ہوئے دو آدمی بول اٹھے "اللہ انصاف فرمائے۔ کل انہی سے جنگ کررہے تھے اور پھر جنت میں آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ گے؟" اس پر حضرت علیؓ نے

Marfat.com

انہیں غصے کی حالت میں کہا: "یہاں سے دور بھاگو، میں اور طلحہ جنت میں اس طرح قریب نہ ہوں گے تو اور کون ہو گا۔"[1]

کسی نے حضرت علیؓ سے جنگ جمل میں شریک ہونے والے آپ کے مخالفین کے بارے میں پوچھا: "کیا وہ مشرک ہیں؟ آپ نے فرمایا: شرک سے تو وہ بھاگ کر آئے ہیں۔ اس نے پھر پوچھا: کیا وہ منافق ہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ ہمارے بھائی ہیں جنہوں نے ہم سے بغاوت کی۔"[2]

جنگ جمل کے بارے میں حضرت عمار بن یاسرؓ کا موقف ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے برعکس تھا۔ کسی نے ان کے سامنے حضرت عائشہؓ کے بارے میں کوئی نامناسب بات کی تو آپ غصے میں آگئے اور کہا: چپ ہو جاؤ، بھونکنے والے گندے آدمی (اسکت مقبوحاً منبوحاً) کیا تم رسول اللہ ﷺ کی محبوب زوجہ کو تکلیف پہنچانا چاہتے ہو؟ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ جنت میں بھی آپ ﷺ کی زوجہ ہی رہیں گی۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ وہ دنیا و آخرت میں رسول اکرم ﷺ کی زوجہ رہیں گی۔ اس کے باوجود انہوں نے جو موقف اختیار کیا اس کے ذریعہ دراصل اللہ تعالیٰ ہمارا امتحان لینا چاہتے تھے کہ آیا ہم ان کی اطاعت کرتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کی۔[3]

ادب و احترام کا اس سے اعلیٰ نمونہ جس کا مظاہرہ ایسے افراد نے کیا جن کے درمیان مشیت ایزدی سے آپس میں جنگ و قتال کا معرکہ گرم ہو چکا تھا اور کیا ہو سکتا

۱۔ طبقات ابن سعد ۳: ۲۲۴

۲۔ بیہقی، السنن الکبری ۸: ۱۷۳

۳۔ البدایۃ والنہایۃ ۷: ۲۶۴

Marfat.com

تھا؟ شمعِ نبوت سے روشنی انہوں نے حاصل کی تھی، یہ اس کا فیض تھا کہ وہ ان کے دلوں کو جگمگاتی رہی اور کینہ اور کدورت کی اندھیریاں ان کے قریب بھی نہ پھٹک سکیں۔

ضرار کی طرف سے حضرت علیؓ کی تعریف اور امیر معاویہؓ کا گریہ وبکا

ایک روز ضرار بن ضمرہ کنانی حضرت معاویہؓ کے پاس آئے تو آپ نے ان سے حضرت علیؓ کے کچھ اوصاف بیان کرنے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے کہا: امیر المؤمنین مجھے معاف رکھیں۔ امیر معاویہؓ نے کہا: نہیں، آپ کو ضرور بیان کرنا ہو گا۔ ضرار نے کہا: جب کچھ بتانا ضروری ہی ہے تو سنیں:

بخدا وہ ایک بلند نظر، دور اندیش اور طاقت ور انسان تھے۔ ان کی بات فیصلہ کُن، اور فیصلہ عادلانہ ہوتا تھا اور ان کے اطراف وجوانب سے علم و حکمت کے چشمے پھوٹتے تھے، آپ دنیا اور اس کی رنگینیوں سے دور رہ کر رات کی تاریکیوں سے انس حاصل کرتے تھے۔ بخدا وہ بہت روتے تھے اور غور و فکر میں محو رہتے تھے۔ اپنی ہتھیلیاں الٹتے پلٹتے تھے اور اپنے آپ سے باتیں کیا کرتے تھے۔ موٹا جھوٹا لباس اور کھانا انہیں پسند تھا۔ بخدا وہ ہمیں جیسے ایک آدمی نظر آتے تھے۔ ان کے پاس ہم جب جاتے تو وہ ہمیں قریب رکھتے اور ہماری باتوں کا جواب دیتے، لیکن اتنے قرب و تقرب کے باوجود ان کی ایسی ہیبت تھی کہ ہم ان سے بات نہیں کر پاتے تھے۔ وہ مسکراتے تو موتیوں جیسے دانت نظر آتے۔ وہ دین داروں کی تعظیم کرتے اور فقرا و مساکین سے محبت رکھتے۔ کوئی طاقت ور آدمی ان سے کسی غلط کام کرانے کی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور کوئی کمزور ان کے عدل سے کبھی مایوس نہ ہوتا تھا۔ میں اللہ کو گواہ ٹھہرا کر کہتا ہوں کہ شب کی

Marfat.com

تاریکیوں میں انہیں بعض مواقع پر میں نے دیکھا کہ محراب کے اندر اپنی ڈاڑھی پکڑے ہوئے اس بے چینی سے تڑپ رہے ہیں کہ جیسے انہیں سانپ نے کاٹ لیا ہو، اور کسی غمزدہ اور ستم رسیدہ شخص کی طرح رو رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس وقت بھی ان کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے اور وہ کہہ رہے ہیں: یا ربَّنا، یا ربَّنا (اے میرے پروردگار، اے میرے پروردگار)۔ اس کے حضور وہ گریہ وزاری کر رہے ہیں اور دنیا سے مخاطب ہو کر فرما رہے ہیں: تم میرے پاس آرہی ہو، تم مجھ پر نظریں جما رہی ہو! افسوس، افسوس، جاؤ کسی دوسرے کو دھوکا دو، میں نے تمہیں تین طلاقیں دے دی ہیں۔ تمہاری عمر مختصر، تمہاری محفل حقیر اور تمہاری اہمیت بہت کم ہے۔ آہ آہ زادِ راہ کتنا قلیل، سفر کتنا طویل اور راستہ کتنا وحشت ناک....."

یہ سن کر امیر معاویہؓ اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے۔ آنسو ان کی ڈاڑھی پر ٹپک پڑے، جسے وہ اپنی آستین سے پونچھتے جاتے تھے۔ روتے روتے حاضرینِ مجلس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ امیر معاویہؓ نے کہا: بلاشبہہ ابو الحسن (حضرت علیؓ) ایسے ہی تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحمتیں نازل فرمائے۔ پھر انہوں نے پوچھا: ضرار، تمہیں ان کا کتنا غم ہے؟ ضرار نے جواب دیا: اتنا جیسے کسی کا کوئی اپنا آدمی خود اسی کی گود میں ذبح کر دیا جائے؛ جس سے اس کے نہ آنسو تھمیں اور نہ اس کا غم سکون پائے۔ یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور چلے گئے۔[1]

١۔ ابو نعیم، حلیة الأولیاء ١: ٨٤؛ ابن عبد البر، الاستیعاب ٢: ٢٤؛ حیاة الصحابة ١: ٤٧-٤٨

Marfat.com

خلافتِ راشدہ میں ادبِ اختلاف کے نمایاں خدوخال

اختلافی مسائل کا جائزہ لیتے وقت یہ بات سامنے آتی ہے کہ اختلافی امور میں کسی بھی صحابی کے دل میں نفسانیت کا کوئی جذبہ کار فرما نہیں ہوتا تھا اور جن اختلافات نے ان اصول و آداب کو جنم دیا ہے، ان کی وجہ بھی حق و راستی کی تلاش ہی تھی۔ عہدِ رسالت کے بعد عہد خلافت راشدہ آدابِ اختلاف کے چند نقوش یہ ہیں:

۱۔ جہاں تک ممکن ہوتا صحابہ کرامؓ اختلاف سے بچنے کی کوشش کرتے اور ان کی یہ شدید کوشش ہوتی کہ اختلاف سرے سے پیدا ہی نہ ہوسکے۔

۲۔ جب اختلاف کے معقول اسباب ہوتے (جیسے کسی سنت یا حدیث کے بارے میں معلومات میں کمی بیشی یا کسی نص کے فہم میں اختلاف وغیرہ)، تو وہ حدودِ اختلاف سے آگے نہ بڑھتے اور حق بات فوراً قبول کرلیتے اور اپنی غلطی کے اعتراف میں کوئی عار محسوس نہ کرتے۔ صحابہ کرامؓ علم و فضل اور تفقہ کے حامل حضرات کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے اور کوئی اپنے مرتبے سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ ہر ایک کا یہ خیال ہوتا کہ رائے ایک مشترکہ معاملہ ہے، ہوسکتا ہے کہ جو رائے اس نے اختیار کی ہے وہ درست ہو، جس کی وجہ سے اسے ترجیح دیتا ہے، البتہ وہ اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کرتا کہ اس کے بھائی کی رائے جسے وہ مرجوح (کمزور) سمجھ رہا ہے، ممکن ہے وہی صحیح ہو۔

۳۔ وہ اسلامی اخوت اور بھائی چارے کو، جس کے بغیر دین کا قیام ممکن نہیں، اسلام کی اہم بنیاد سمجھتے تھے اور اسے اجتہادی مسائل میں اتفاق و اختلاف سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

Marfat.com

۴۔ اعتقادی مسائل میں اختلاف نہیں ہوا کرتا تھا، اختلاف صرف فروعی مسائل تک محدود رہتا۔

۵۔ قرّا اور فقہا کی حیثیت سیاسی قیادت کی طرح نمایاں ہوا کرتی تھی، ہر ایک کا معروف اور غیر متنازعہ مقام و مرتبہ ہوا کرتا تھا۔

٦۔ اگر کوئی کسی کی لغزش کی نشان دہی کرتا تو اسے ایک طرح کا تعاون سمجھا جاتا، نہ کہ عیب جوئی یا بے جا تنقید۔

عہدِ تابعین میں ادبِ اختلاف

امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں یہ طریقہ کار اپنایا ہوا تھا کہ وہ صحابہ کرامؓ کو مدینے سے باہر سکونت اختیار کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ صحابہ کرامؓ جہاد، تعلیم و تدریس، امارت و قضا وغیرہ جیسی اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سفر تو کرتے مگر مدینہ منورہ جسے دارالخلافہ کی حیثیت حاصل تھی، ان کا مستقل مقام و مستقر ہوتا۔ صحابہ کرام چونکہ دعوتِ اسلامی کے علم بردار اور اس کے ہراول دستہ تھے، اس لیے ضروری تھا کہ وہ خلیفہ کے قریب رہ کر خلافت کی ذمہ داریوں کی ادائگی کے سلسلے میں ان کی معاونت کریں، اور امت کے معاملات و مسائل کو حل کرنے میں ان کے شریک کار رہیں۔

حضرت عثمانؓ نے جب بار خلافت اٹھایا تو انہوں نے صحابہ کرامؓ کو مدینہ چھوڑ کر دوسرے اسلامی شہروں میں اقامت اختیار کرنے کی اجازت دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا، جس کے بعد قرّا اور فقہاے کرام مفتوحہ علاقوں اور آباد کردہ شہروں میں

Marfat.com

منتقل ہونے لگے۔ چنانچہ صرف کوفہ وبصرہ میں تین سو سے زیادہ صحابہ کرام سکونت پذیر ہوگئے، اسی طرح مصروشام میں بھی کئی صحابہؓ مقیم تھے۔

ایک روایت کے مطابق، غزوہ حنین سے واپسی کے بعد صرف مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ ہزار صحابہ موجود تھے جن میں سے آپ کے انتقال کے وقت دس ہزار باقی رہ گئے تھے اور دو ہزار دوسرے شہروں کو نقل مکانی کر چکے تھے۔[1]

فقہا اور قرّا صحابہ کرامؓ سے تابعین نے علم حاصل کرکے آگے منتقل کیا، جیسے مدینہ میں سعید بن المسیب (جنہیں حضرت عمرؓ کے فقہ کے حامل اور ان کا راوی کہا جاتا ہے) مکہ میں عطاء بن ابی رباح، یمن میں طاؤوس، یمامہ میں یحییٰ بن ابی کثیر، بصرہ میں حسن بصری، شام میں مکحول، خراسان میں عطاء، کوفہ میں علقمہ وغیرہ۔ یہ تمام حضرات اکثر مواقع پر انہی صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں فتویٰ اور اجتہاد کا کام انجام دیتے تھے جن سے انہوں نے علم وفقہ حاصل کیا تھا اور استنباطِ احکام میں جن کے طریقوں سے وہ متاثر ہوئے تھے۔ تابعین کرام بھی آپس کے اختلافات میں صحابہ کے آداب پر کاربند رہے اور ان کے مقرر کردہ حدود واطوار سے ذرہ برابر بھی انحراف نہیں کیا۔ یہی وہ فقہا ہیں جن سے بعد میں آنے والی نسلیں متاثر ہوئیں اور انہی سے فقہ کی دولت پائی۔ دیت کے بارے میں مندرجہ ذیل دو مکالموں سے تابعین کے آدابِ اختلاف کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے:

۱۔ محمد بن حسن الحجوی الفاسی، الفکر السامي ۱: ۳۱۱

Marfat.com

۱۔ امام حدیث عبد الرزاق نے شعبی کے ذریعے سے روایت بیان کی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں: ایک مرتبہ قاضی شریح کے پاس ایک شخص آیا اور ان سے انگلیوں کی دیت (خون بہا) کے بارے میں سوال کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہر انگلی پر دس اونٹ، اس نے کہا۔ سبحان اللہ، کیا انگوٹھا اور درمیان کی بڑی انگلی دونوں برابر ہیں؟ قاضی شریح نے کہا: افسوس تم پر! سنت نے ایسا قیاس کرنے سے منع کیا ہے۔ اس کی پیروی کرو اور نئی بات نہ نکالو۔[1]

۲۔ موطأ امام مالک میں مروی ہے کہ ربیعہ کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن المسیب سے عورت کی انگلی کے خون بہا کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا: دس اونٹ، میں نے پوچھا دو انگلیوں کا؟ انہوں نے کہا: بیس اونٹ۔ میں نے پوچھا: تین انگلیوں کا؟ کہا: تیس اونٹ۔ میں نے پھر پوچھا: چار پر؟ انہوں نے کہا: بیس اونٹ۔ میں نے کہا: جب زخم بڑھ گیا اور تکلیف میں اضافہ ہو گیا تو خون بہا کم ہو گیا۔ اس پر حضرت سعید بن المسیب نے پوچھا: کیا تم عراقی ہو؟ میں نے کہا: نہیں، میں تو اپنے علم کی توثیق کرانا چاہتا ہوں یا اپنے علم میں اضافے کا خواہش مند ہوں۔ انہوں نے کہا: برادر زادے سنت یہی ہے۔[2]

زیادہ سے زیادہ اختلاف اسی درجے کا ہوتا تھا، نہ تو کوئی اپنی رائے کی درستی کا دعوی کرتا اور نہ ہی دوسرے کو جہالت کا الزام دیتا تھا، نہ اسے یہ زعم ہوتا کہ میں ہی حق پر ہوں اور دوسرا باطل پر ہے۔

۱۔ الفكر السامي ۱: ۳۹۱، ابن منذر نے بھی صحیح سند کے ساتھ اسے روایت کیا ہے۔

۲۔ موطأ مع شرح زرقاني ۴: ۱۸۸؛ عبد الرزاق، المصنف ۹: ۳۴۹؛ بیہقی، السنن ۸: ۹۶

Marfat.com

حضرت سعید بن المسیب اور اہل حجاز کا مسلک یہ ہے کہ تیسرے حصے تک مرد اور عورت کے خون بہا میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے زیادہ کی صورت میں عورت کی دیت مرد کے مقابلے میں آدھی ہوگی۔ اس کی دلیل حضرت عمرو بن شعیب کی وہ روایت ہے جو انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے بیان کی ہے کہ عورت کی دیت تیسرے حصے تک مرد کے برابر ہے؛[1] جبکہ عراقی فقہا کی رائے یہ ہے کہ شروع ہی سے عورت کی دیت مرد کے مقابلے میں آدھی ہے۔[2]

امام اوزاعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کی ایک دفعہ مکہ میں ملاقات ہوئی تو امام اوزاعیؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے پوچھا: آپ لوگ رکوع میں جاتے اور اس سے اٹھتے وقت رفع یدین کیوں نہیں کرتے؟ امام ابو حنیفہؒ نے کہا: اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح روایت مروی نہیں۔ امام اوزاعیؒ نے کہا: یہ کیسے؟ خود مجھ سے امام زہریؒ نے یہ حدیث بیان کی، ان سے سالم نے، ان سے ان کے باپ عبد اللہ بن عمرؓ نے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نماز کی ابتدا اور رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت ہاتھ اٹھایا کرتے تھے۔

امام ابو حنیفہؒ نے کہا: مجھ سے حماد نے، ان سے ابراہیمؒ نخعی نے، ان سے علقمہ اور اسود نے اور ان سے ابن مسعودؓ نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف نماز کی ابتدا میں رفع یدین فرماتے اور اس کے بعد کسی موقع پر بھی ہاتھ نہ اٹھاتے تھے۔

۱۔ سنن نسائی ۸: ۵۴؛ دار قطنی، السنن ۴: ۳۶۴

۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن قدامہ، المغني ۸: ۳۱۴- ۳۱۵

Marfat.com

امام اوزاعیؒ نے کہا: میں آپ کو زہری سے سالم کی اور ان سے ان کے باپ (ابن عمرؓ) کی روایت سنا رہا ہوں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ مجھ سے حماد نے اور ان سے ابراہیمؒ نے روایت بیان کی ہے؟

امام ابو حنیفہؒ نے کہا: حماد زہری سے اور ابراہیم نخعی سالم سے زیادہ فقیہ ہیں، اور علقمہ بھی ابن عمرؓ سے کم نہیں، اگر ابن عمرؓ کو شرفِ صحابیت حاصل ہے تو اسود کے بھی بڑے فضائل ہیں، جبکہ عبداللہ بن مسعودؓ کی جلالتِ قدر تو سب کو معلوم ہے۔ اس پر امام اوزاعیؒ خاموش ہو گئے۔[1]

امام ابو حنیفہؒ سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ آپ نے کہا: ہم نے جو آرا ظاہر کی ہیں، ان کے قبول کرنے کے سلسلے میں کسی پر جبر نہیں کرتے، اور نہ کسی سے ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہماری رائے تسلیم کرے، اگر کسی کے پاس اس سے اچھی بات ہو تو وہ اسے پیش کرے۔[2]

حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ تمام حضرات سنت کے پیروکار تھے۔ سنت جب صحیح سند کے ساتھ ان تک پہنچتی تو وہ قطعی طور پر اس سے اختلاف نہ کرتے، البتہ حدیث کے مفہوم کو سمجھنے میں اختلاف واقع ہوتا تھا۔ ہر ایک دوسرے کے اخذ کردہ مفہوم کو اس وقت تک صحیح مانتا جب تک لفظ کے اندر اس کی گنجائش موجود ہوتی، اور اس مفہوم کے خلاف دوسرے فریق کے پاس مستند دلائل بھی نہ ہوتے۔

۱۔ الفكر السامي ۱: ۳۲۰

۲۔ قرطبی، ابو عمر یوسف بن عبدالبر، الانتقاء في فضائل الأئمة الثلاثة الفقهاء، تحقیق: عبدالفتاح ابو غدة، حلب، مکتب المطبوعات الاسلامیۃ، ص ۱۴۰

Marfat.com

اعتقادی اور فقہی اختلافات پر سیاسی اختلاف کے اثرات

جن اختلافات کا اوپر ہم نے ذکر کیا ہے ان کا تعلق عوام کی اکثریت سے تھا۔ ان کا بیشتر حصہ فقہی اختلافات پر مشتمل تھا جن میں حتمی فیصلے کے لیے قرآن و سنت ہی کو مرجع بنایا جاتا۔ بعض اوقات اس طرح کے اختلافات کی بنیاد صرف اتنی ہوتی ہے کہ ایک شخص تک کوئی حدیث پہنچتی جبکہ دوسرے کو اس کا علم نہ ہوتا یا اس کی بنیاد نص یا اس کے الفاظ کے سمجھنے میں اختلاف ہوتا۔

ان فقہی اختلافات پر جو چیز سب سے زیادہ اثر انداز ہوئی وہ خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور دارالخلافہ کی کوفہ سے شام منتقلی کے بعد ظہور پذیر ہونے والے سیاسی اختلافات تھے۔ اس نئی صورت حال نے امت مسلمہ کے اندر اختلافات کی خلیج کو بہت وسیع کر دیا اور دائرۂ اختلاف میں ایسے نئے امور شامل ہو گئے جو اس سے پہلے اس کا حصہ نہ تھے۔ اس کے نتیجے میں ہر علاقے کے افراد کا ان تک پہنچنے والی روایت پر انحصار کرنے کا رجحان شدید تر ہو گیا۔ دیگر علاقوں میں پھیلی ہوئی روایت کے سلسلے میں ان کا رویہ شک و شبہہ اور عدم اعتماد کا ہوتا، جس کے پیچھے در حقیقت سیاسی وابستگیاں اور گروہی کشمکش کار فرما تھی۔ چنانچہ عراق کے دونوں شہروں کوفہ اور بصرہ میں متنوع سیاسی افکار نے جنم لیا اور کئی جہتیں اختیار کیں اور اپنے تمام تر تنوع اور پیچیدگیوں کے ساتھ یہ افکار دوسرے علاقوں کی طرف منتقل ہونے شروع ہو گئے۔ یہاں شیعہ، جہمیہ، معتزلہ، خوارج اور دیگر کئی راہِ حق سے منحرف گروہ اور فرقے پروان چڑھے۔ جھوٹی حدیثیں اور سیاسی رنگ کے واقعات گھڑنے کے رجحان کو بھی یہیں فروغ حاصل ہوا۔ یہ صورتِ حال اتنی سنگین ہو گئی کہ حضرت امام مالک پکار اٹھے

Marfat.com

کہ کوفہ جھوٹ کی ٹکسال گاہ ہے؛[1] اور امام زہریؒ نے کہا: ہمارے ہاں جو حدیث بالشت بھر ہوتی ہے وہ عراق پہنچ کر ایک گز طویل ہو جاتی ہے۔[2]

اس صورت حال کے پیش نظر خود اہل عراق قبول حدیث کے سلسلے میں محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس ضمن میں انہوں نے قبول حدیث کے لیے ایسی کڑی شرطیں عائد کیں جن کا اس دور سے پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے پیچھے ان کی یہ خواہش کار فرما تھی کہ ان کا فقہی ورثہ حق سے منحرف فرقوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہے۔ اہل حجاز کا رویہ عراقیوں سے کہیں بڑھ کر احتیاط پسندی پر مبنی تھا۔ اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اہل حجاز عراقیوں یا شامیوں کی کوئی روایت اس وقت تک قبول نہیں کرتے تھے جب تک کہ خود حجاز کے اندر اس کی بنیاد نہ مل جاتی۔[3]

ایک حجازی عالم سے پوچھا گیا کہ ایک حدیث جسے سفیان ثوری نے منصور معتمر سے، انہوں نے ابراہیم نخعی سے، انہوں نے علقمہ نخعی سے اور انہوں نے عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہو، اس سلسلہ روایت کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے جبکہ عراقیوں کے نزدیک اسے سب سے زیادہ مضبوط اور قابلِ اعتماد سند سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے جواب دیا: اگر اس کی کوئی بنیاد حجاز میں ہو تب تو وہ قابل قبول ہو گی، بصورت دیگر نہیں۔[4]

۱۔ الفكر السامي ۱: ۳۱۳

۲۔ الانتقاء، ص ۱۴۰

۳۔ الفكر السامي ۱: ۳۱۳

۴۔ ایضاً

Marfat.com

ایک عباسی خلیفہ نے امام مالکؒ کے ممتاز استاذ ربیعہ بن ابی عبد الرحمن کو، جن کا تعلق مدینہ سے تھا، اپنا وزیر اور مشیر مقرر کیا مگر وہ جلد ہی معذرت کر کے اس منصب سے علیحدہ ہو گئے اور مدینہ لوٹ آئے۔ ان سے پوچھا گیا: آپ نے اہل عراق کو کیسے پایا؟ تو انہوں نے جواب دیا: وہ ایسے لوگ ہیں جن کے نزدیک ہمارا حلال حرام ہے اور ہمارا حرام حلال ہے۔ وہاں چالیس ہزار ایسے افراد ہیں جو دین کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جو نبی ہماری طرف مبعوث ہوا اس نبی سے الگ ہے جو ان کی طرف بھیجا گیا۔[1]

اس گفتگو کا تعلق اگرچہ عراق کے اہلِ سنت اور جمہور امت سے نہیں، بلکہ حق سے منحرف گروہوں سے ہے، تاہم اس سے فقہی تحریک پر پڑنے والے دور رس اثرات کی طرف اشارہ ملتا ہے، نیز اس اختلاف کی نشان دہی بھی ہوتی ہے جو عراق و حجاز کے فقہا کے نقطۂ نظر اور ان کے طریق استدلال میں موجود تھا۔

اہلِ حجاز سمجھتے ہیں کہ ضبط سنت کا کام انہوں نے ہی کیا۔ اور کوئی سنت ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوئی۔ مدینہ طیبہ ہی میں وہ دس ہزار صحابہ کرام زندگی بھر رہے۔ جنہیں رسول اللہ ﷺ نے غزوہ حنین کے بعد چھوڑا تھا۔ سیدنا عمر بن عبد العزیز سارے اہل عرب کو اور مسلمانانِ عالم کو خطوط لکھ کر سنت و فقہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ لیکن وہ اہل مدینہ سے مسائل و معاملات کے بارے میں خود استفسار کرتے اور تعلیم سنت کی درخواست کرتے تاکہ دوسروں کو اس سے آگاہ کریں۔

۱۔ ایضاً ۱: ۳۱۲

Marfat.com

مدینہ میں صحابہ کرامؓ کی فقہ و آثار اور سنت نبوی کے سب سے بڑے عالم سعید بن مسیّبؒ اور ان کے اصحاب ہیں جن سے احناف، مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ وغیرہم سب نے استفادہ کیا۔ اکثر تابعی علماے مدینہ کا خیال تھا کہ فقہی ضروریات کی تکمیل کے لیے وہی سنن و آثار کافی ہیں جو ان کے علم میں ہیں۔ کسی طرح سے بھی راے کی استعمال کی کوئی ضرورت نہیں، جبکہ بعض حضرات راے کے حق میں تھے۔ جیسے امام مالک کے شیخ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن، جن کی اس سلسلے میں اتنی شہرت ہوئی کہ "ربیعۃ الرأی" ان کا لقب ہی ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود ان علما کی کثرت تھی جو سنت و اثر ہی کو کافی سمجھتے تھے۔

فقہاے عراق، جیسے ابراہیم نخعی[1] اور ان کے اصحاب بھی علم و حدیث میں اپنے آپ کو کم نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے درمیان بھی تین سو سے زیادہ صحابہ کرام موجود رہ چکے تھے۔ عبداللہ بن مسعودؓ جیسی شخصیت ان میں موجود تھی جنہیں أفقه أصحاب الرسول بكتاب الله سمجھا جاتا تھا۔ سیدنا علیؓ نے اپنی مدت خلافت وہیں گزاری۔ ان کے علاوہ ابوموسیٰ اشعری اور عمار بن یاسر وغیرہم جیسے جلیل القدر اصحاب رسول انہیں میں اپنی زندگی گزار چکے تھے۔

۱۔ ابو عمران ابراہیم بن یزید نخعی کوفی، فقہ ابن مسعود کے وارث اور دبستان فکر و قیاس کے بہت بڑے فقیہ۔ ۹۶ھ میں وفات ہوئی۔ حدیث و فقہ کے جامع تھے۔ بالاتفاق انہیں ثقہ اور حجت مانا گیا ہے۔ شعبی نے ان کی وفات کی خبر سن کر کہا: ابراہیم نے اپنے جیسا کوئی شخص اپنے پیچھے نہیں چھوڑا۔ ان کے تفصیلی حالات ان کتابوں میں ملاحظہ ہوں: طبقات ابن سعد ۶: ۷۱؛ صفة الصفوة ۳: ۸۶؛ تذكرة الحفاظ ۱: ۷۳؛ الحلية ۴: ۲۱۷؛ تهذيب التهذيب ۱: ۸۶

Marfat.com

ابراہیم نخعی اور اکثر علماے عراق کی راے تھی کہ احکام شرع معنوی حیثیت سے مصالح اور انسانی مفادات پر مشتمل ہیں۔ ایسے محکم اصول اور علتوں پر ان کی تعمیر ہوئی جو ان سارے مصالح پر حاوی ہوں، اور ان سب کا منبع و مأخذ کتاب اللہ اور سنن رسول ﷺ ہیں۔ فرعی احکام کی مشروعیت بھی انہیں علل و اسباب کے تحت ہوئی ہے اور فقیہ وہی ہے جو ان احکام کی علتیں اور ان کی غرض و غایت سمجھتا ہو، تاکہ کسی بھی حکم کو وہ ان کے ساتھ ہی مربوط رکھ سکے۔ علماے عراق کا یہ بھی خیال تھا کہ نصوص شرعیہ تو رسول اللہ ﷺ کے بعد موقوف ہو گئے اس لیے کتاب و سنت سے ماخوذ احکام کی علتیں جب تک سامنے نہ ہوں اس وقت تک قانونی ضروریات کی تکمیل مشکل اور ناممکن ہے۔

حسن بن عبیدہ نخعی سے روایت ہے انہوں نے کہا میں نے ابراہیم نخعی سے عرض کیا کہ آپ کے جو فتاویٰ ہیں کیا آپ نے انہیں سن رکھا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ میں نے کہا: بغیر سنے ہوئے آپ فتویٰ دیتے ہیں؟ فرمایا: بغیر سنے ہوئے معاملات کو سنی ہوئی چیزوں پر قیاس کر لیتا ہوں۔[1] عراق کی فقہی درس گاہ کا یہی نشانِ امتیاز تھا کہ اگر حدیث نہ ہو تو راے اور قیاس سے کام لو۔

سعید بن مسیّب اور علماے مدینہ علل و اسباب کو قابلِ التفات نہیں سمجھتے۔ کتاب و سنت میں حل نہ ملتا تو شدید ضرورت کے وقت ہی اس کی طرف توجہ کرتے اور انہیں ضرورت بھی کیا پڑتی۔ خود سعید بن مسیّب کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ، ابو بکر، عمر، عثمان اور علی (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے سارے احکام اور فیصلوں کا مجھے علم ہے۔

۱۔ خطیب بغدادی، الفقیہ والمتفقہ ۱: ۲۰۳

Marfat.com

عراق میں جو نئے واقعات و مسائل پیش آئے اور وہاں کے ماحول میں جو تبدیلیاں آئیں، ان سے مدینہ منورہ کا ماحول محفوظ رہا اور وہاں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ اس لیے اکثر علماے مدینہ کا یہ طریقہ تھا کہ ان سے کوئی سوال کیا جاتا جس کا کسی حدیث میں کوئی حل نظر آتا تو جواب دے دیتے، ورنہ معذرت کر دیتے۔ مسروق سے ایک مسئلہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: میں نہیں جانتا۔ ان سے کہا گیا کہ اپنی راے سے قیاس کر کے بتایئے، انہوں نے کہا: مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے قدم پھسل نہ جائیں۔[1]

جس مسئلہ میں کوئی حدیث نہ ہو اس میں راے اور قیاس سے اہل مدینہ بہت ہچکچاتے تھے۔ ابن وہب کہتے ہیں: امام مالکؒ نے کہا: رسول اللہ ﷺ سید المرسلین اور امام المسلمین تھے، ان سے کوئی سوال ہوتا تو اس کا جواب اسی وقت دیتے جب ان کے پاس وحی آتی۔ رسول اللہ کا جب یہ طریقہ تھا تو یہ کتنی بڑی جرأت و جسارت ہے کہ راے قیاس، تقلید، عرف، عادۃ، سیاست، ذوق، کشف، خواب، استحسان یا اٹکل سے کوئی جواب دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے مدد اور اسی کا بھروسہ ہے۔[2]

دونوں دبستانِ فقہ کے اختلاف اور تنقید و مباحثہ کے باوجود ادبِ اختلاف اور اس کی حدود ہی میں رہ کر سب نے کام کیا۔ نہ کسی کی تکفیر و تفسیق ہوئی، نہ کسی پر ارتکابِ منکر کا الزام، اور نہ اس سے اظہارِ براءت و بے زاری۔

۱۔ إعلام الموقعین ۱: ۲۵۷

۲۔ ایضاً ۱: ۲۵۶

Marfat.com

امام ابو حنیفہؒ اپنے شیخ امام جعفر صادقؒ کے حضور میں

تابعین کے مابین آدابِ اختلاف کی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے آخر میں ہم امام ابو حنیفہؒ اور ان کے استاد امام جعفر صادقؒ کے مابین ہونے والی گفتگو پیش کرتے ہیں، جس سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ حضرات اختلافی مسائل میں بحث مباحثہ کے دوران کس رواداری، باہمی احترام اور آدابِ مراتب کا خیال رکھتے تھے۔

ابن ابی شُبرمہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: میں اور ابو حنیفہؒ امام جعفر صادقؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے آپ کو سلام کیا، میری آپ سے دیرینہ دوستی تھی۔ میں نے آپ سے کہا: اللہ تعالیٰ ہمیں آپ سے مستفید ہونے کے مواقع فراہم کرتا رہے۔ میں اپنے ساتھ اہلِ عراق میں سے ایک آدمی لایا ہوں جو فقہ اور رائے میں کافی درک رکھتا ہے۔ امام جعفرؒ نے کہا: کیا یہ وہی ہیں جو دین کے معاملات میں اپنی رائے سے کام لیتے ہیں، پھر خود ہی فرمانے لگے: یہ نعمان تو نہیں؟ ابو حنیفہؒ نے کہا: جی ہاں، اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ امام جعفرؒ کہنے لگے: ابو حنیفہ، اللہ سے ڈرو اور دین کے معاملات میں اپنی رائے سے کام مت لو۔ سب سے پہلے جس نے قیاس اور رائے سے کام لیا وہ ابلیس تھا کہ جب اسے اللہ تعالیٰ نے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس نے کہا: میں اس (آدم) سے بہتر ہوں، کیونکہ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔

انہوں نے پھر امام ابو حنیفہؒ سے پوچھا: مجھے کوئی ایسا کلمہ بتاؤ جس کا پہلا حصہ شرک اور آخری حصہ ایمان ہے۔ ابو حنیفہؒ نے کہا: میں نہیں جانتا۔

امام جعفرؒ نے فرمایا: یہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے کہ اگر کوئی شخص صرف لا الہ کہہ کر رک جائے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

Marfat.com

پھر پوچھا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون سا گناہ بڑا ہے؟ کسی بے گناہ کو قتل کرنا یا زنا؟ ابو حنیفہؒ نے جواب دیا: کسی کو قتل کرنا۔ آپ نے فرمایا نہیں، اس لیے کہ قتل کے سلسلے میں تو دو گواہوں کی گواہی قابلِ قبول قرار دی ہے جبکہ زنا کے لیے چار گواہ ضروری قرار دیے ہیں۔ پھر بھلا تمہارے راے اور قیاس کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

پھر آپ نے پوچھا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک روزے اور نماز میں کس فرض کی اہمیت زیادہ ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے کہا: نماز کی۔

آپ نے فرمایا: ایسی صورت میں حائضہ عورت روزوں کی تو قضا کرتی ہے جبکہ نماز کی قضا اس پر فرض نہیں۔ آخر کیوں؟ اے اللہ کے بندے اللہ سے ڈرو اور راے و قیاس سے کام مت لیا کرو، ورنہ کل ہم اور آپ اللہ کے حضور جب کھڑے ہوں گے تو ہم تو یہ کہیں گے کہ اللہ اور اس کے رسول نے یہ کہا، جبکہ آپ اور آپ کے ساتھی کہیں گے کہ ہم نے ایسا سمجھا اور یہ ہماری راے تھی، پھر خود ہی سوچ لو کہ اللہ تعالیٰ ہم سے اور آپ سے کیا سلوک کرے گا۔[1]

امام جعفر صادق کے یہ سوالات ایسے نہ تھے جو امام ابو حنیفہؒ جیسے شخص کو لاجواب کر دیتے۔ امام صاحب نے صرف اہل بیتِ رسول ﷺ کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر سوال کے جواب میں خاموشی کو ترجیح دی۔

مذکورہ مکالمات سے پتا چلتا ہے کہ اعلیٰ و ارفع ادب نبوی فریقین کا معین و مددگار رہا کرتا تھا اور ان کے اختلافات بھی باہمی ربط و تعلق کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کر سکے۔ مؤرخین نے اس دور کی شدت کے جو بعض واقعات تحریر کیے ہیں، وہ عام طور

۱۔ إعلام الموقعین ۱: ۲۵۵-۲۵۶

Marfat.com

پر کلامی فرقوں کے ہیں جن کے اختلافات اعتقادی امور میں پائے جاتے تھے اور وہ ایک دوسرے سے کفر و فسق اور بدعت کے القاب چسپاں کرنے لگے تھے۔ کتب تاریخ میں ان کے بھی ایسے واقعات مل جائیں گے کہ انہوں نے ادب اختلاف کی پابندی کی ہے۔

خوارج سے حضرت ابن عباسؓ کا مناظرہ

عبد اللہ بن مبارک[1] سے روایت ہے، انہوں نے کہا، مجھ سے عکرمہ بن عمار نے ان سے سماک حنفی نے بیان کیا کہ ابن عباسؓ کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا کہ سیدنا علیؓ نے فرمایا: خارجی جب تک خروج نہ کریں، ان سے جنگ نہ کرو۔ مگر وہ جلد ہی خروج کریں گے۔ ابن عباسؓ نے کہا: امیر المؤمنین! نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھیے، میں ان کے یہاں جاکر ان کی بات سننا اور کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا: مجھے آپ کے بارے میں ان سے کچھ خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا: میں حسن اخلاق کا مالک تھا اور کبھی میں کسی کو تکلیف بھی نہیں دیتا تھا۔ میں نے خوب اچھے یمنی کپڑے پہنے، کنگھا کیا اور خارجیوں کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا: یہ لباس کیا ہے؟ میں نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ [الاعراف۷: ۳۲] (آپ کہیے کس نے حرام کی اللہ کی وہ زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی اور پاک رزق)۔ میں نے کہا کہ رسول

۱۔ ابو عبد الرحمن، عبد اللہ بن مبارک بن واضح حنظلی تمیمی۔ محدث۔ حافظ۔ فقیہ اور حجت۔ زہد و تقویٰ میں یکتا۔ علم و عمل اور جہاد و تجارت کے میدان بیک وقت سنبھالے۔ ہیت (عراق) میں ۱۸۱ھ میں انتقال ہوا۔ آپ کے حالاتِ زندگی کے لیے ملاحظہ ہو: طبقات ابن سعد ۷: ۳۷۲؛ الشیرازی ۷۷؛ الجرح والتعدیل ۲/ ق۲/ ۱۷۹؛ تذکرۃ الحفاظ ۱: ۲۷۴؛ الحلیۃ ۸: ۱۶۲؛ سِیر أعلام النبلاء ۸: ۳۷۹ومابعد؛ تہذیب التہذیب ۵: ۳۸۲

Marfat.com

اللہ ﷺ کو بہترین یمنی لباس پہنتے ہوئے میں نے خود دیکھا ہے۔ وہ بولے ہمیں تسلیم ہے۔ آپ یہاں کیسے آئے؟ میں نے کہا کہ اپنے دوست کے پاس سے آیا ہوں جو رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی اور ان کے رفیق ہیں اور اصحابِ رسول اللہ ﷺ وحی کے تم سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ قرآن حکیم بھی انہیں میں نازل ہوا ہے۔ ان کی دعوت تمہیں اور تمہارا پیغام انہیں پہنچادوں گا۔ ہماری کیا چیز تمہیں بری لگی ہے؟ اس سوال پر کچھ لوگ بول پڑے۔ ان سے ہرگز بات نہ کرو۔ قریش جھگڑالو ہوتے ہیں۔ خود اللہ نے ان کے بارے میں فرمادیا ہے: ﴿بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ﴾ [الزخرف ۴۳: ۵۸] (بلکہ وہ لوگ جھگڑالو ہیں)۔

بعض نے کہا: بات کرلی جائے۔ چنانچہ دو یا تین آدمی میرے پاس آئے اور کہا: چاہیں تو آپ بات کریں یا ہم گفتگو شروع کریں۔ میں نے کہا: تم لوگ بات کرو۔ اس کے بعد انہوں نے کہا: تین باتیں ہمیں بری لگیں، اور وہ یہ کہ انہوں نے انسانوں کو حَکم بنایا جبکہ حکم ذاتِ خداوندی ہے: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلا لله﴾ [الانعام، یوسف] (حکم تو اللہ ہی کا ہے)۔

میں نے کہا کہ خرگوش[1] کے بارے میں چوتھائی درہم کا معاملہ اللہ ہی نے بندوں کے سپرد کیا اور انہیں حَکم بنادیا ہے۔ نیز زوجین کے بارے میں قرآن حکیم میں ہے: ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا﴾ [النساء ۴: ۳۵] (ایک فیصل مرد والوں کی طرف سے اور ایک عورت والوں کی طرف سے بھیجو)۔

۱۔ اس آیتِ کریمہ کی طرف اشارہ ہے: ﴿فَجَزَاءٌ مِثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ﴾ [المائدۃ ۵: ۹۵] (تو اس کا بدلہ یہ ہے کہ جیسا اس نے قتل کیا ویسا ہی جانور دے۔ تم میں سے دو ثقہ آدمی اس کا فیصلہ کریں)۔ احرام پہنے ہوئے حاجی کے شکار کے متعلق یہ حکم ہے۔

Marfat.com

زوجین اور بندے کے معاملات میں حکم بنانا افضل ہے یا امت کے معاملات میں جس سے خون ریزی ختم ہو کر اختلاف اتحاد اتفاق میں تبدیل ہو جائے؟ انہوں نے کہا: ہاں صحیح ہے!

دوسری بات یہ کہ انہوں نے امیر المؤمنین بننے میں توقف کیا اور علیحدہ رہے، لہٰذا وہ امیر المؤمنین نہیں تو امیر الکافرین ہیں (معاذ اللہ)۔ میں نے کہا: قرآن وسنت سے میں دلیل دوں تو مان لوگے؟ انہوں نے کہا: ہاں! میں نے کہا: تم نے سنا ہے یا میرا خیال ہے کہ تم تک یہ بات پہنچی ہی ہو گی کہ صلح حدیبیہ کے روز سہیل بن عمرو کی رسول اللہ ﷺ سے گفتگو ہوئی تو آپ ﷺ نے سیدنا علیؓ سے فرمایا: لکھیے: هذا ما صالح عليه محمد رسول الله - ﷺ -. اس پر کفارِ قریش نے کہا کہ اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول مان لیں تو جنگ ہی نہ کریں۔ آپ نے سیدنا علیؓ سے فرمایا: علی! اسے مٹا دو۔ ابن عباسؓ نے کہا: کیا میں نے تمہاری بات کا جواب دے دیا؟ سب نے کہا: ہاں۔

اب رہا جنگِ جمل و صِفین کے بارے میں تمہارا یہ کہنا کہ انہوں (حضرت علیؓ) نے قتال کیا، لیکن نہ قیدی بنائے اور نہ مالِ غنیمت حاصل کیا۔ مجھے بتاؤ کیا تم اپنی ماں (حضرت عائشہؓ) کو قیدی بنا کر دوسری عورتوں کی طرح اسے بھی اپنے لیے حلال کر لو گے؟ اب اگر ہاں کہو گے تو انکارِ کتاب اللہ کے مرتکب ہو گے اور دائرۂ اسلام سے نکل جاؤ گے۔ لہٰذا تم دو گمراہیوں کے درمیان گھر گئے ہو۔

Marfat.com

کوئی بھی چیز پیش کر کے میں کہتا، کیا میں نے اس کا جواب دے دیا؟ وہ کہتے: ہاں! اس طرح ان میں سے دو ہزار ہمارے ساتھ واپس آ گئے اور صرف چھ سو باقی رہ گئے۔[1]

ذرا غور کیجیے! ان لوگوں نے تلواریں بے نیام کی ہوئی تھیں، اور اپنے مخالفین کو مباح الدم ٹھہرایا ہوا تھا، لیکن اس کے باوجود جب حق بات سامنے لا کر ان سے بحث کی گئی تو ان کی بڑی تعداد نے اس کو قبول کر لیا۔ جب انہیں قرآن و سنت سے نصیحت کی گئی تو وہ باز آ گئے اور جب انہیں مذاکرات کرنے کا کہا گیا تو کھلے دل کے ساتھ وہ بات مان گئے۔ ہمارے دور کے مسلمانوں کے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے!

۱۔ إعلام الموقعین ۱: ۲۱۴- ۲۱۵۔ دوسرے سلسلۂ اسناد میں مختلف الفاظ سے یہ روایت مذکور ہے۔

Marfat.com

استنباطِ احکام میں مناہجِ ائمہ کا اختلاف

فقہی مسالک

صحابہ کرام اور کبار تابعین کے بعد جو فقہی مسالک ظہور پذیر ہوئے، ان کی تعداد بعض کے نزدیک تیرہ ہے۔ سارے ائمہ اسی مسلک اہل سنت کے تھے جو آج بھی جمہور امت کا مسلک ہے لیکن صرف آٹھ یا نو مسالک مدون ہو سکے۔ اور ان میں بعض کی تدوین مکمل ہوئی اور بعض ادھورے ہی رہ گئے۔ ان کی اسی مدوّن فقہ سے ان کے اصول مسلک اور مناہج فقہ معلوم کیے جاتے ہیں۔ وہ نو (۹) ائمہ کرام یہ ہیں:

۱۔ ابو سعید حسن بن یسار بصری (متوفیٰ ۱۵۰ھ)

۲۔ ابو حنیفہ نعمان بن ثابت بن زوطی (متوفیٰ ۱۵۰ھ)

۳۔ اوزاعی ابو عمرو عبد الرحمن بن عمرو بن محمد (متوفیٰ ۱۵۷ھ)

۴۔ سفیان بن سعید بن مسروق ثوری (متوفیٰ ۱۶۰ھ)

۵۔ لیث بن سعید (متوفیٰ ۱۵۷ھ)

۶۔ مالک بن انس اصبحی (متوفیٰ ۱۷۹ھ)

۷۔ سفیان بن عُیینہ (متوفیٰ ۱۹۸ھ)

۸۔ محمد بن ادریس شافعی (متوفیٰ ۲۰۴ھ)

۹۔ احمد بن حنبل (متوفیٰ ۲۴۱ھ)

Marfat.com

نیز ظاہری مسلک کے امام داؤد بن علی اصبہانی بغدادی (م ۲۷۰ھ)، جو الفاظِ قرآن و حدیث کے ظاہر مفہوم پر عمل کرتے تھے؛ اسی نسبت سے ان کے مسلک کو ظاہری کہا جانے لگا۔

ان کے علاوہ بھی کئی مشہور ائمہ گزرے ہیں، جیسے اسحاق بن راہویہ (م۲۳۸ھ)، ابو ثور ابراہیم بن خالد کلبی (م۲۴۰ھ) جن کا مسلک رائج نہیں ہو سکا اور نہ ان کے متبعین زیادہ ہوئے، یا انہیں بھی مشہور مسالک کے مقلدین ہی سمجھا گیا۔

جن ائمہ کے مسالک کی جڑیں مضبوط رہیں اور جو آج تک باقی ہیں، اور تمام مسلم ممالک میں ان کے بے شمار مقلدین ہیں اور ان کے فقہ و اصولِ فقہ کو آج بھی مسلمانوں کی اکثریت فقہ و افتا کی بنیاد مانتی ہے، ان کی تعداد چار ہے:

امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل

مشہور ائمہ کے مناہجِ اجتہاد

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کو فقہاے حدیث و آثار سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے اہل مدینہ سے فقہ لی اور ان کے علوم حاصل کیے۔ اپنی جلالتِ شان کے باوجود چونکہ فقہ حنفی پر فکر و قیاس کا غلبہ ہے، اس لیے امام ابو حنیفہ کو بعض لوگ فقہ اہل الراے کا وارث و امین اور اس دبستان کے امام و مقتدا کی حیثیت سے جانتے ہیں۔

دبستانِ سعید بن مسیّب جو فقہ و آثارِ صحابہ کی بنیاد پر قائم ہے اور جس کے طریقہ و منہج کو مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ نے اپنایا، اور دبستانِ ابراہیم نخعی جو حدیث و سنت نہ ہونے کی صورت میں راے پر عمل کرتا ہے؛ ان دونوں کا اختلاف فطری طور پر بعد کے ان مشہور ائمہ کرام کے درمیان میں بھی سرایت کر گیا، جنہوں نے ان میں سے

Marfat.com

کسی ایک دبستان کو بھی اپنایا اور اس سے بھی کسی کو اختلاف نہیں کہ اس کے حدت اور تیزی کم ہوئی۔ خلافت جب بنو عباس کو منتقل ہوئی تو انہوں نے بعض جلیل القدر علماے حجاز کو سنت کی تعلیم و تبلیغ کے لیے عراق بلایا، جن میں سے چند حضرات یہ ہیں: ربیعہ بن ابی عبد الرحمن، یحییٰ بن سعید،[1] ہشام بن عروہ،[2] محمد بن اسحاق[3] وغیرہم۔

اسی طرح بعض عراقی بھی مدینہ پہنچے اور علماے حجاز سے استفادہ کیا۔ مثلاً ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم[4] اور محمد بن حسن شیبانی۔[1] ان دو مؤخر الذکر علما نے امام

۱۔ ابو سعید یحییٰ بن سعید بن فروخ قطان تمیمی بصری عظیم المرتبت حافظ حدیث، ثقہ امام اور حجت ہیں۔ امام مالک کے ہم عصر اور علم رجال اور صحت و ضعفِ حدیث کے سب سے بڑے عالم تھے۔ ان کے زیادہ فتاویٰ مسلک امام ابو حنیفہ کے مطابق ہیں۔ ۱۹۸ھ میں انتقال ہوا۔ ان کے حالاتِ زندگی ان کتابوں میں ملاحظہ ہوں: طبقات ابن سعد ۷: ۲۹۳؛ حلیة الأولیاء ۸: ۳۸۲؛ الجرح والتعدیل ۴/ ق ۲/ ۱۵۰؛ تاریخ بغداد ۱۴: ۱۳۵؛ تذکرة الحفّاظ ۱: ۲۹۸؛ تہذیب التہذیب ۱۱: ۲۱۶

۲۔ ابو المنذر ہشام بن عروہ بن زبیر بن عوام (متوفی ۱۴۵ھ) مشہور محدث و حافظ ثقہ امام اور فقیہ تھے۔ اکابر علماے مدینہ میں آپ کا شمار تھا۔ طبقات ابن سعد ۷: ۳۲۱؛ الجرح والتعدیل ۴/ ق ۲/ ۶۳؛ تاریخ بغداد ۱۴: ۳۷؛ تہذیب التہذیب ۱۱: ۴۸ میں آپ کے حالاتِ زندگی مرقوم ہیں۔

۳۔ محمد بن اسحاق بن یسار مدنی متوفی ۱۵۱ھ بغداد۔ آپ مغازی و سیر کے امام تھے، آپ کے حالاتِ زندگی ان کتابوں میں ہیں: طبقات ابن سعد ۷: ۳۲۱؛ الجرح والتعدیل ۳/ ق ۲/ ۲۰۱؛ تاریخ بغداد ۱: ۲۱۴؛ المیزان ۳: ۴۹۸؛ تہذیب التہذیب ۹: ۳۹

۴۔ ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم بن حبیب انصاری کوفی بغدادی (م ۱۸۳ھ۔ بغداد)۔ امام ابو حنیفہ کے ممتاز تلامذہ میں آپ کا شمار ہے۔ ہادی، مہدی اور ہارون الرشید کے دور میں قاضی القضاۃ تھے۔ آپ کے حالاتِ زندگی ان کتابوں میں ہیں: تاریخ بغداد ۱۴: ۲۴۲؛ تذکرة الحفّاظ ۱: ۲۹۲؛ الجرح والتعدیل ۴ق ۲/ ۲۰۱؛

Marfat.com

مالک سے بھی تحصیل علم کی۔[۲] ان سب حضرات کے ذریعہ حجازیوں اور عراقیوں کے افکار و خیالات ایک سے دوسری جگہ منتقل ہوئے۔ اس کے باوجود امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کے طرزِ فکر میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ اگرچہ بعض مناہج استنباط میں اختلاف بھی ہے اور امام ابو حنیفہؒ کا منہج ان حضرات سے کچھ جداگانہ نظر آتا ہے۔

ا۔ منہج امام ابو حنیفہ

تینوں ائمہ کرام (مالک، شافعی، حمد بن حنبل) کے مناہج فقہ سے امام ابو حنیفہ کا اسلوب اور انداز واضح طور پر مختلف تھا۔ منہج حنفی کے قواعد و اصول جو آپ نے خود بیان فرمائے ہیں، ان کا خلاصہ آپ کی زبانی یہ ہے:

> میں سب سے پہلے کتاب اللہ سے اخذ و استنباط کرتا ہوں۔ اگر اس میں نہ ملے تو سنت رسول اور ثقہ رواۃ سے منقول احادیث صحاح کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اور جب کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ میں نہیں پاتا تو اصحابِ رسول میں جس کا قول چاہتا ہوں اس کو لے لیتا ہوں۔ ان کے علاوہ کسی دوسرے کا قول

طبقات ابن سعد ۷: ۳۳۰؛ الجواهر المضيئه ۲: ۲۲۰۔ آپ کی سوانح و مناقب پر کئی ایک مستقل تصانیف ہیں۔

۱۔ ابو عبداللہ محمد بن حسن شیبانی (م۱۸۹ھ ری)۔ امام ابو حنیفہ کے تلمیذ خاص اور فقہ حنفی کے ناشر تھے۔ ہارون الرشید کے دور میں رقہ اور رَی کے عہدہ قضا پر فائز رہے۔ آپ کے حالات زندگی کے لیے ملاحظہ ہو: طبقات ابن سعد ۷: ۳۳۶؛ المیزان ۳: ۵۱۳؛ تاریخ بغداد ۲: ۱۷۲؛ الشذرات ۱: ۳۲۱؛ الجواهر المضيئه ۲: ۴۲

۲۔ الفكر السامي ۱: ۴۳۴، ۴۳۵

Marfat.com

نہیں لیتا۔ جب معاملہ ابراہیم، شعبی اور ابن مسیّب وغیرہ (کئی ایک نام آپ نے گنوائے) تک پہنچتا ہے تو انہیں کی طرح میں خود اجتہاد کر لیتا ہوں۔

منہجِ ابو حنیفہ کے یہ سب سے بنیادی اور اہم اصول ہیں، دوسرے فرعی اور ثانوی اصول بھی ہیں جو انہیں اصول کی بنیاد پر قائم اور انہیں سے نکلے ہوئے ہیں اور جو دوسرے مناہج کے بعض اصول سے مختلف ہیں۔ چند اصول وضوابط یہ ہیں:

- لفظ عام کی دلالت لفظ خاص کی طرح قطعی ہے۔[1]
- عموم کے خلاف صحابی کے مسلک سے اس کی تخصیص ہو جاتی ہے۔[2]
- کثرتِ رُواۃ ترجیح کی بنیاد نہیں۔
- مفہوم شرط وصفت معتبر نہیں۔[1]

۱۔ عام: جو لفظ ان سارے افراد واشیا پر حاوی ہو جن کے لیے اس کی وضع ہوئی ہے، جیسے لفظ کل اور جمیع وغیرہ۔
خاص: جو لفظ کسی معین چیز کو بتلائے جیسے اسمائے اعلام (اشخاص واماکن وغیرہ کے نام)۔
قطعی: جس سے تیقن وایقان حاصل ہو جائے۔ کبھی نصوص قطعی الدلالۃ اور قطعی الثبوت ہوتی ہیں۔ جیسے قرآنِ حکیم کی ظاہری آیات اور اس کی صحیح ومحکم نصوص۔ کبھی یہ نصوص قطعی الثبوت اور ظنی الدلالۃ ہوتی ہیں۔ جب ایسے طریقے سے ان کا ثبوت ہو جو قطعی ہوں اور شک کی گنجائش نہ ہو، جیسے آیاتِ قرآن اور احادیث متواترہ۔ اور جب ان کے کچھ معانی میں مختلف احتمالات ہوں تو ظنی الدلالہ ہوں گے۔ جیسے یہ آیت کریمہ ﴿يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ﴾ [البقرۃ۲: ۲۲۸] (اپنی جانوں کو وہ تین حیض تک روکے رہیں)۔ یہ نص تو قطعی ہے کیوں کہ یہ آیت قرآن ہے جو تواتر کے ساتھ ہم تک منقول ہے لیکن طہر اور حیض کے سلسلے میں ظنی الدلالۃ ہے۔ کیونکہ قروء سے طہر مراد ہے یا حیض؟ اس میں علما کا اختلاف ہے اور دونوں طرح کے اقوال ہیں۔

۲۔ عام دلائل میں کبھی کچھ تخصیص بھی ہوتی ہے۔ جیسے استثناء وغیرہ۔ بعض علما کے نزدیک دلیلِ عموم کے خلاف کسی صحابی کے عمل یا مسلک سے بھی ان کی تخصیص ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان کے اس عمل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسی ہی کوئی چیز دیکھی یا سنی ہے جس سے اس عام کی تخصیص ہو چکی ہے۔

Marfat.com

- عمومِ بلویٰ میں خبر واحد مقبول نہیں۔[۲]
- قرینۂ صارفہ نہ ہو تو امر، قطعی طور پر وجوب کا متقاضی ہے۔
- فقیہ راوی کا اپنی روایت کے خلاف عمل ہو تو روایت نہیں، بلکہ اس کی رائے پر عمل ہو گا۔
- خبرِ واحد اور قیاس جلی میں تعارض ہو تو قیاس جلی مقدم ہو گا۔
- بوقت ضرورت قیاس کو چھوڑ کر استحسان[۱] قبول کر لیا جائے گا۔

۱۔ دلالتِ مفہوم: لفظ کوئی ایسا حکم بتائے جو کلام میں مذکور نہ ہو جیسے قرآن حکیم کی اس آیت میں ہے: ﴿قُلْ لا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا﴾ [الانعام۶: ۱۴۵] (آپ کہیے مجھے وحی ہوئی اس میں کہ کسی کھانے والے پر کوئی حرام کھانا نہیں پاتا سوائے اس کے کہ وہ مردار یا بہتا ہوا خون ہو)۔ مسفوحاً کا مفہوم یہ ہے کہ دم غیر مسفوح (نہ بہا ہوا خون) جیسے جگر اور تلی جائز ہے۔

مفہومِ شرط: لفظ کوئی حکم مشروط بتائے کہ وہ شرط نہ پائی جائے تو حکم بھی نہ پایا جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَإِنْ كُنَّ أُولاتِ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ [الطلاق۶۵: ۶] (اور اگر وہ حاملہ ہوں تو انہیں بچہ پیدا ہونے تک نان و نفقہ دو)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عدت گزارنے والی حاملہ کو وضع حمل تک نان و نفقہ دینا واجب ہے۔ اور اس کا مفہوم شرط یہ ہے کہ عدت گزارنے والی غیر حاملہ کے لیے نان و نفقہ واجب نہیں۔

مفہومِ صفت: کسی صفت سے موصوف لفظ کا ایسا حکم بتالان کہ صفت نہ پائے جانے کی صورت میں بیان کردہ حکم کی نقیض ثابت ہو جائے۔ جیسے قرآن حکیم میں ہے: ﴿وَحَلائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلابِكُمْ﴾ [النساء۴: ۲۳] (اور تمہارے حقیقی بیٹوں کی بیویاں) یہ آیت اپنے لفظ سے بتا رہی ہے کہ حقیقی لڑکے کی بیوی۔ اس کے باپ پر حرام ہے اور اس کا مفہوم صفت یہ ہے کہ متبنیٰ (گود لیا ہوا) کی بیوی اس کے باپ پر حرام نہیں۔ اس لیے کہ وہ اس کے صلب سے نہیں ہے۔

۲۔ عمومِ بلویٰ: فقہا کی زبان میں عمومِ بلویٰ سے ایسی چیزیں مراد ہیں جن سے بچنا مشکل یا محال ہو۔ جیسے سڑک کی کیچڑ یا پرنالوں کا پانی، گوریا یا پرندوں کا بیٹ کرنا، اس طرح کے جانوروں کے اڑتے اور پھڑ پھڑاتے وقت کپڑوں پر پیشاب کے چھینٹے پڑنا، یا گھروں میں بلیوں کا گھومنا پھرنا وغیرہ۔

Marfat.com

ابو حنیفہ سے منقول ہے کہ "ہمارے علم نے ہمیں یہی راہ دکھائی جو ہماری سوچ و فکر اور اندازے کے مطابق سب سے بہتر ہے، اور اگر کوئی اس سے بہتر چیز لائے تو ہم اسے قبول کرلیں گے۔"

۲۔ منہج امام مالک

امام مالک کا اپنا ایک الگ منہج فکر ہے۔ وہ کہتے ہیں:

کیا جب جب کوئی شخص ہمارے پاس آئے تو اس کے بحث و جدل کی وجہ سے ہم وہ چیز چھوڑ دیں جسے جبریل رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے۔[۲]

اس کا ذکر پہلے ہی گزر چکا ہے کہ آپ دبستانِ سعید بن مسیّب کے حجازی منہج سے وابستہ ہیں۔ آپ کے مسلک کے اصول و ضوابط کا خلاصہ اور ان کی ترتیب درج ذیل ہے:

- نص کتاب اللہ
- ظاہر نص، یعنی عموم
- دلیل نص، یعنی مفہوم مخالف
- مفہوم نص، یعنی مفہوم موافق
- تنبیہ نص، یعنی علّت پر تنبیہ، جیسے اس آیت میں ہے: ﴿فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا﴾ [الأنعام۶: ۱۴۵]

۱۔ استحسان کا مطلب ہے: کسی مسئلہ میں اسی جیسے دوسرے مسائل کا حکم دیکھ کر تخفیف کے خیال سے اس کے خلاف کرنا۔ دیکھیے: ڈاکٹر یعقوب باحسین، رفع الحرج في الشريعة الإسلامية، ص۳۹۶

۲۔ الفكر السامي ۱: ۳۷۸

Marfat.com

قرآن حکیم سے اخذ کردہ یہ پانچ اصول ہیں اور حدیث و سنت سے بھی دس (۱۰) اصول ماخوذ ہیں:

- اجماع
- قیاس
- عمل اہل مدینہ
- استحسان
- ذرائع کا سدِّ باب[1]
- مصالحِ مرسلہ[2]
- قول صحابی (جب کہ صحابی مشہور و ممتاز اور سند صحیح ہو)
- اختلاف کا لحاظ (جب مخالف کی دلیل قوی ہو)
- استصحاب
- شرائع ماقبل (گزشتہ شریعتیں)

۱۔ سدِّ ذرائع: لغوی طور پر ذریعہ ایسے وسیلہ اور سبب کو کہتے ہیں جس سے کسی دوسری چیز تک پہنچا جائے خواہ وہ حسی ہو یا معنوی، خیر ہو یا شر۔ اصطلاح میں اس کو کہتے ہیں جو ایسی ممنوع چیز تک پہنچائے جس میں فساد اور برائی پائی جائے۔ جیسے اجنبی عورت کو دیکھنا جو زنا کا ذریعہ ہے، اس لیے ایسی نظر سدِّ ذریعہ کے طور پر حرام ہے۔

۲۔ مصالحِ مرسلہ: ہر وہ منفعت جو شارع کے مقاصد اور تصرفات کے مطابق ہو، جس کا اعتبار کرنے یا نہ کرنے کی کوئی متعین اصل (دلیل) نہ ہو، جیسے عقدِ استصناع، کہ کسی شخص سے ایسی چیز بنانے کا معاہدہ کیا جائے جو اس معاہدہ کے وقت موجود نہ ہو۔ شریعت نے ایسی چیز پر ہی معاہدہ کو جائز قرار دیا ہے جو پوری طرح معلوم ہو اور خریدار کو بروقت اس کی حوالگی کی جاسکے؛ جبکہ استصناع کی صورت میں چیز موجود نہیں ہوتی۔ مگر اس بیع کے مصالح اور فائدے واضح ہیں اور اس کی ممانعت سے لوگ ایک بڑی سہولت سے محروم ہو جائیں گے۔ اس لیے شارع نے اس کا لحاظ کیا ہے۔ اسی طرح "بیع تعاطی" (زبان سے الفاظ ادا کیے بغیر لین دین) کی ضرورت اور اس کے مصالح بھی معلوم ہیں، اس لیے بعض علما نے اس میں زبانی ایجاب و قبول کی شرط نہیں رکھی۔

Marfat.com

۳۔ منہج امام شافعی

امام شافعی نے اپنے اصول فقہ کے رسالہ الرسالة میں اجمالاً اپنے مسلک کے اصول و قواعد تحریر کر دیے ہیں۔ یہ کتاب اصولِ فقہ کی پہلی مدون کتاب سمجھی جاتی ہے۔ آپ کہتے ہیں:

اصل قرآن و سنت ہے۔ اگر ان میں نہ ملے تو ان کی روشنی میں قیاس کیا جائے۔ اگر رسول اللہ ﷺ سے متصل صحیح الاسناد حدیث ہو تو کافی ہے۔ اجماع خبر واحد سے بڑی چیز ہے۔ حدیث کا ظاہر (مفہوم) لیا جائے گا۔ اگر کئی معانی کا احتمال ہو تو اسے لیا جائے گا جو ظاہر سے قریب تر ہو۔ احادیث برابر ہوں تو زیادہ صحیح الاسناد حدیث قابل ترجیح ہو گی۔ حدیث منقطع صرف ابن مسیّب کی لی جاسکتی ہے۔ اصل کو اصل پر قیاس کیا جاسکتا ہے اور نہ اس میں کوئی چون و چرا۔ فرع میں کیوں اور کیسے کا سوال ہوتا ہے۔ اگر اصل پر اس کا قیاس صحیح ہو تو وہ بھی صحیح ہے اور قابل حجت۔[1]

مذکورہ اقتباس سے واضح ہے کہ امام شافعی کے نزدیک تشریعِ احکام میں قرآن و سنت دونوں برابر ہیں۔ حدیث چونکہ ایک اصل (بنیادی مأخذ) ہے، اس لیے اس میں سند کی صحت و اتصال کے علاوہ اور کوئی شرط نہیں۔ اصل کے بارے میں کوئی چون و چرا نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے شہرتِ حدیث[2] کی بھی کوئی شرط نہیں جب وہ عموم بلویٰ میں وارد

۱۔ الفكر سامي ۱: ۳۹۸

۲۔ حدیث مشہور: جس کے دو سے زیادہ طرق (سندیں) ہوں، یا جسے ہر طبقہ میں تین یا اس سے زیادہ راویوں نے روایت کیا ہو۔ دیکھیے: شرح نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر، ص۱۷

Marfat.com

ہو۔ جب کہ امام ابو حنیفہ کے ہاں یہ شرط ہے۔ حدیث کے عملِ اہل مدینہ سے اختلاف نہ ہونے کی بھی شرط نہیں، جیسا کہ امام مالک کے نزدیک ہے۔ لیکن امام شافعی نے مراسیل سعید بن مسیّب کے علاوہ اور کوئی حدیث مرسل[1] قبول نہیں کی۔ کیونکہ وہ انہیں متصل الاسناد مانتے ہیں۔ باقی لوگوں کی مراسیل احادیث میں آپ نے امام مالک، امام ثوری اور معاصر علماے حدیث سے اختلاف کیا جو انہیں حجت مانتے تھے۔[2] حجیتِ استحسان کو رد کر کے حنفیہ اور مالکیہ دونوں سے آپ نے اختلاف کیا۔ استحسان کے ردّ میں ایک کتاب بھی بنام إبطال الاستحسان تحریر کی ہے اور آپ کا یہ مقولہ بھی مشہور ہے "جس نے استحسان کیا اس نے گویا ایک نئی شریعت وضع کی۔" مصالح مرسلہ کا بھی آپ نے ردّ کیا ہے اور اس کی حجیت سے بھی انکار کیا ہے۔ ظاہر مربوط علت پر جو قیاس نہ کیا گیا ہو وہ بھی آپ کے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ عمل اہل مدینہ کی حجیت اور احناف کے عائد کردہ شرائط جیسے مشہور ہونا وغیرہ نہ ہونے پر ترکِ حدیث سے بھی آپ نے اختلاف کیا ہے اور امام مالک کی طرح صرف اہل حجاز کی احادیث پر انحصار کرنے سے بھی آپ کو اختلاف تھا۔

اہم اصولِ مسلک شافعی کا یہ اجمال ہے جن سے اصولِ حنفیہ و مالکیہ سے اس کا اختلاف بھی واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔

۱۔ حدیث مرسل: وہ روایت جس کی سند تابعی کے بعد ساقط ہو جیسے کسی تابعی کا کہنا: قال رسول اللہ ﷺ کذا... اور یہ نہ بتائے کہ اسے رسول اللہ ﷺ سے کس نے روایت کی۔

۲۔ الفكر السامي ۱: ۳۹۹

Marfat.com

۴۔ منہجِ امام احمد بن حنبل[1]

امام احمد بن حنبل کے منہج کے اصول و قواعد منہج امام شافعی کے مذکورہ قواعد سے بہت قریب ہیں، ان کے اخذ و استنباط کی ترتیب یہ ہے:

۱۔ نصوص قرآن و سنت: ان کی موجودگی میں کوئی دوسری چیز قابل توجہ نہیں۔ حدیث صحیح مرفوع پر عمل اہل مدینہ، رائے، قیاس، قولِ صحابی یا اجماع جو علم بالمخالفت پر قائم ہو ان میں سے کسی چیز کو ان پر مقدم نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ اگر کوئی نص نہ ہو تو صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ دیکھے جائیں گے اگر کسی کا قول مل جائے اور اس میں صحابہ کے کسی اختلاف کا علم نہ ہو تو اسے لیا جائے گا۔ اس پر کسی عمل، رائے اور قیاس کو مقدم نہ کیا جائے گا۔

۳۔ صحابہ کرامؓ کا اختلاف ہو تو اسے اختیار کیا جائے گا جو کتاب و سنت سے زیادہ قریب ہے اور اگر کتاب و سنت سے قریب تر مسئلہ کی وضاحت نہ ہو سکے تو کسی قول پر جزم و یقین کیے بغیر اختلاف کا ذکر کر دیا جائے گا۔

۴۔ حدیث مرسل و ضعیف کے خلاف کوئی دوسری حدیث یا قول صحابی یا اجماع نہ ہو تو اسے ہی لیا جائے گا اور قیاس پر یہ حدیث مقدم ہو گی۔

۵۔ گزشتہ دلائل میں سے کچھ نہ ملے تو بوقت ضرورت قیاس کو دلیل بنایا جا سکتا ہے۔

۶۔ سدّ ذرائع

۱۔ امام احمد کے مزید اصول اور مختلف فیہ اصول کے لیے دیکھیے: إعلام الموقعین، المدخل، اور أصول مذهب الإمام أحمد

Marfat.com

ظاہری منہج

یہاں اختصار کے ساتھ ظاہری مسلک کے امام داؤد ظاہری اور ابن حزم کے منہج کے اصول و قواعد کا ذکر کر دینا بھی غالباً مناسب ہی ہو گا، کیونکہ اس کا مسلمانوں میں کچھ اثر ہے اور اس کے متبعین آج بھی پائے جاتے ہیں۔ احناف اور پھر مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ سے اس ظاہری مسلک کا زبردست اختلاف رہا ہے۔ ابن حزم ظاہری نے امام شافعی کی بہت سی فضیلتوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔

ظاہری مسلک کے نمایاں اصول یہ ہیں:

آیات و احادیث کے ظاہر سے تمسّک، اور جن علل و احکام اور مصالح کے لیے ان کی مشروعیت (آمد) سمجھی جاتی ہے، ان پر ان آیات و احادیث کے ظاہر کو مقدم رکھنا چاہیے۔ جب تک علت محل اوّل (مقیس علیہ) میں منصوص اور اس کا وجود محل ثانی (مقیس) میں اس طرح قطعی نہ ہو کہ حکم بمنزلہ تحقیق مناط[1] ہو جائے، اس وقت تک قیاس[2] پر عمل نہ کیا جائے۔ استحسان پر عمل حرام ہے۔ صرف عہد صحابہ کے اجماع سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔ حدیث مرسل و منقطع قابل عمل نہیں، جو حنفیہ،

۱۔ تحقیق مناط: کسی وصف کا کسی حکم کی علت ہونا سمجھ لیا جائے تو اس کے ذریعہ مجتہد ان امور کو جاننے کی کوشش کرے جن میں وہ علت پائی جاتی ہے۔

مناط: علت کو کہتے ہیں، کیونکہ حکم اسی سے متعلق ہوتا ہے۔ جس وقت یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹنے کی علت چوری ہے تو مجتہد وہ امور جاننے کی کوشش کرتا ہے جن میں چوری کی صفت پائی جائے اور اسی طرح جیب تراش اور کفن چور پر قیاس کر لیتا ہے کیونکہ ان دونوں کے اندر بھی چوری کا وصف پایا جاتا ہے اور یہ علت موجود ہے۔

۲۔ قیاس: (اصول فقہ کی کتابوں میں) قیاس پر اعتراضات اور علت کے اسبابِ قدح سے متعلق مباحث میں اسے دیکھیں۔

Marfat.com

مالکیہ، شافعیہ کے خلاف ہے۔ اسی طرح ماقبل اسلام کی شریعتوں پر کوئی عمل نہیں۔ عمل بالرائے بھی جائز نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ﴾ [الانعام۶: ۳۸] (ہم نے کتاب میں کسی چیز کے ذکر کو نہ چھوڑا)۔ حکمِ منصوص کو غیر منصوص کی طرف لے جانا حدود اللہ سے تجاوز کرنا ہے۔ مفہومِ مخالف لینا کسی کے لیے جائز نہیں۔ عوام، علما اور ہر وہ مکلف جو اپنی کوشش سے کچھ بھی اجتہاد کر سکے، اس پر تقلید حرام ہے۔[1]

ہماری رائے

حقیقت یہ ہے کہ بہت سے اصول جو ائمہ وفقہا کی طرف منسوب ہیں، وہ ان کے اقوال سے ماخوذ ہیں جن میں سے کچھ کی تو روایت صحیح بھی نہ ہوگی۔ اس لیے ان پر اڑے رہنا، ان کا دفاع کرتے رہنا اور ان پر اعتراضات وجوابات میں محو ہو کر کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ سے غافل ہو جانا؛ یہی چیزیں ان مضر اختلافات کا سبب ہے جو خود ائمہ کرام کا ہرگز مقصود نہیں۔ انہیں چیزوں نے دورِ آخر کے مسلمانوں کو کاموں اور بلند مقاصد سے ہٹا کر معمولی کاموں کی راہ پر لگا دیا اور امت مسلمہ آج اس نیچے درجہ تک پہنچ کر اس میں غلطاں و پیچاں ہے۔

۱۔ ان اصولوں کی یہ تلخیص ہم نے ابن حزم کی دو کتابوں النُبذ في أصول الفقه اور الإحكام في أصول الأحكام سے کی ہے۔

Marfat.com

علمی اختلافات
میں اہلِ علم کا طرزِ عمل*

علمی اختلافات کی حقیقت، اس کے ارتقا اور اسباب و وجوہات سے واضح ہے کہ اہل علم میں اختلاف آرا ایک فطری اور ناگزیر امر ہے۔ اس لیے کہ ایک طرف بہت سے شرعی نصوص ایک سے زیادہ معانی کی گنجائش رکھتے ہیں اور دوسری طرف انسان کی سوچ اور زاویہ نظر میں تفاوت پایا جاتا ہے۔

اس حتمی نتیجے کے باوجود ان اختلافات کے سلسلے میں علماے سلف اور خلف کے طرز عمل کا اگر جائزہ لیا جائے تو بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے طرز عمل میں تضاد اور تعارض ہے، اور اس وجہ سے بعض طالبانِ علم الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں کہ علماے سلف سے اس سلسلے میں جو کچھ منقول ہے، اور ہم نے جو قطعی نتیجہ نکالا ہے، ان دونوں کے درمیان تطبیق کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

اسی بنا پر ہم نے مناسب سمجھا کہ (فائدہ کی تکمیل اور اشتباہ کو دور کرنے کی خاطر) یہاں وہ باتیں ذکر کر دی جائیں جو اس سلسلے میں اہل علم سے منقول ہیں۔ اس کے ساتھ ان کے اقوال کی توجیہ، وضاحت اور ان کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کی جائے۔

---

* ماخوذ از: ڈاکٹر محمد ابو الفتح البیانونی، دراسات في الاختلافات العلمية، قاہرہ ـ دارالسلام، ۲۰۰۶م (الباب الثانی، ص ۶۳- ۷۴)

Marfat.com

حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم وفضله میں ایک باب: باب جامع بیان ما یلزم الناظر في اختلاف الفقهاء کے عنوان سے قائم کیا ہے۔[1] اس میں وہ لکھتے ہیں: فقہا کا اس باب میں اختلاف ہے اور ان سے دو قول منقول ہیں:

اول: یہ کہ علماے صحابہؓ اور ان کے بعد کے ائمہ کرام کا اختلاف ایک رحمت ہے جس سے گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کے جس کسی مسئلے میں مختلف اقوال ملیں اس کے لیے جائز ہے کہ وہ ان میں سے جس قول کو چاہے اختیار کرے۔ اسی طرح یہی طرز عمل دیگر ائمہ کے اقوال کے حوالے سے بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر اس پر یہ واضح ہو جائے کہ وہ غلط ہے، اس لیے کہ وہ کتاب و سنت کے نص یا اجماع امت کے خلاف ہے تو پھر اس کی اتباع کرنا اس کے لیے جائز نہیں۔ اگر ان وجوہ سے اس کے سامنے یہ بات ظاہر نہ ہو تو پھر اس کے لیے اس کے قول کو اختیار کرنا جائز ہے، اگرچہ اسے اس کے صحیح اور غلط ہونے کا علم نہ ہو اور وہ ان عام لوگوں میں سے ہو جن کے لیے کسی عالم سے مسئلہ پوچھ کر اس کی تقلید کرنا جائز ہے، اگر اسے اس کی وجہ معلوم نہ ہو۔ اس صورت میں وہ عامی قرار پائے گا جس کے لیے کسی عالم کی تقلید جائز ہوتی ہے اگرچہ اسے اس کی دلیل معلوم نہ ہو۔

اس مفہوم کا قول حضرت عمر بن عبد العزیز، قاسم بن محمد اور سفیان ثوری سے منقول ہے،[2] اور کچھ لوگ اسی کے قائل ہیں اور اس سلسلے میں ان کی دلیل نبی ﷺ

۱۔ ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن عبد البر النمری القرطبی، جامع بیان العلم وفضله، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، (۱۳۹۸ھ) ۲: ۷۸- ۷۹

۲۔ اس طرح کا قول سفیان ثوریؒ سے مختلف کتابوں میں نقل کیا گیا ہے، اسی طرح خطیب بغدادی نے اپنی کتاب (الفقیه والمتفقه ۲: ۶۹) میں سفیان ثوریؒ سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اس میں فقہا کا اختلاف ہے، لہٰذا میں اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو اس پر عمل کرنے سے نہیں روکتا۔"

Marfat.com

کا یہ ارشاد ہے: أصحابي كالنجوم بأيّهم اقتديتم اهتديتم[1] (میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں تم ان میں سے جس کی بھی پیروی کرلوگے ہدایت پالوگے)۔

اہل علم کے ایک گروہ کے نزدیک یہ ضعیف مذہب ہے، اکثر فقہا اور اہل نظر نے اسے تسلیم نہیں کیا، اس کی دلیل ان شاء اللہ آگے اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے، جبکہ متقدمین ومتأخرین محدثین کے ایک گروہ کا میلان اسی کی طرف ہے۔

پھر علامہ ابن عبدالبر نے ان ائمہ کرام میں سے بعض حضرات کے قول کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ ان میں سے ایک وہ ہے جسے انہوں نے قاسم بن محمد بن ابو بکر سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں: نبی ﷺ کے اصحاب کے عمل میں جو اختلاف تھا اس سے اللہ نے امت کو نفع پہنچایا۔ عمل کرنے والا ان میں سے جس کے عمل کی بھی اتباع کرے گا، اسے محسوس ہوگا کہ اس کے لیے بڑی گنجائش ہے اور محسوس ہوگا کہ اس سے بہتر شخص نے اس پر عمل کیا ہے۔[2]

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے یہ قول منقول ہے کہ "میری یہ آرزو نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں اختلاف نہ ہوتا۔ اس لیے کہ اگر ان سب سے ایک ہی قول منقول ہوتا تو لوگ تنگی میں پڑ جاتے جبکہ یہ حضرات قابل تقلید نمونہ تھے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ان میں سے کسی کے قول پر عمل کرلے تو اس کے لیے گنجائش ہوگی۔"[3]

۱۔ یہ حدیث مختلف ضعیف طرق سے مروی ہے جن میں سے کوئی بھی صحیح نہیں۔ اس کی تخریج اور اس پر کلام کے لیے دیکھیے: ملا علی قاری، فتح باب العناية، حلب مکتب المطبوعات الاسلامیۃ ۱: ۱۳- ۱۴

۲۔ خطیب بغدادی، الفقیہ والمتفقہ، حلب، مکتب المطبوعات الاسلامیۃ ۲: ۵۹، ۶۰ میں ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ روایت کیا۔

۳۔ اس سے ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ خطیب بغدادی نے اسے ذکر کیا ہے؛ الفقیہ والمتفقہ ۲: ۵۹، ۶۰

Marfat.com

قاسم بن محمد سے سرّی نمازوں میں قراءت خلف الامام کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ اگر تم پڑھ لو تو تم سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے کچھ اصحاب ایسا کرتے رہے ہیں اور اگر نہ پڑھو تو اس میں بھی اصحاب رسول میں سے بعض کا نمونہ موجود ہے۔

یحییٰ بن سعید سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: اہل فتویٰ ہمیشہ فتویٰ دیتے رہے ہیں، ان میں سے ایک کسی چیز کو حلال قرار دیتا اور دوسرا اسے حرام قرار دیتا ہے، تو حرام قرار دینے والا یہ نہیں سمجھتا کہ حلال کرنے والا اسے حلال قرار دینے کی وجہ سے ہلاک ہو گیا اور نہ حلال قرار دینے والا یہ سمجھتا ہے کہ حرام قرار دینے والا اسے حرام قرار دینے کی وجہ سے ہلاک ہو گیا۔"

لیکن امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب میں سے جو حضرات ان کے مسلک پر ہیں ان کا اور لیث بن سعد، اوزاعی، ابو ثور اور اہل نظر (راے) کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اختلاف میں جب تعارض ہو تو ایک قول درست اور دوسرا غلط ہے اور علما کے درمیان جب اختلاف ہو تو ضروری ہے کہ کتاب و سنت اور اجماع سے دلیل طلب کی جائے اور ان کے اصول پر قیاس کیا جائے اور یہ مشکل نہیں۔ اگر یہ واضح نہ ہو تو توقف کرنا ضروری ہے، اور یقین کے بغیر کوئی قطعی بات کہنا روا نہیں۔ لیکن اگر ان میں کوئی اپنی ذات کے دائرے میں ان میں سے کسی چیز کے استعمال کے لیے مجبور ہو جائے تو اس کے لیے اسی طرح تقلید جائز ہے جس طرح عام لوگوں کے لیے جائز ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ان بعض ائمہ کے اقوال کے مزید کچھ اقتباسات نقل کیے ہیں جن سے ان کے قول کی تائید ہوتی ہے، انہی میں سے ایک روایت انہوں نے

Marfat.com

اَشہب سے نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ امام مالک سے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کے اختلاف کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ ان آرا میں غلطی اور درستگی دونوں کا امکان ہے۔

ابن القاسم کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک اور لیث کو رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کے اختلاف کے بارے میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اس میں توسع ہے یعنی ان کے اختلاف سے گنجائش پیدا ہوتی ہے ایسا نہیں ہے بلکہ اس میں غلط اور صحیح دونوں کا امکان ہے۔

یحییٰ کہتے ہیں کہ مجھے یہ خبر پہنچی کہ لیث بن سعد نے کہا کہ جب اختلاف سامنے آئے گا تو ہم احتیاط کے پہلو پر عمل کریں گے۔

ابن عبدالبر نے دوسری رائے کے قائلین کے دلائل ذکر کرنے اور ان میں سے ایک دوسرے کے بعض اجتہادات کو غلط قرار دینے کے سلسلے میں سلف کے اقوال نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ علما کی کتابوں میں یہ چیز بکثرت پائی جاتی ہے، یہی صورت رسول اللہ ﷺ کے اصحاب، تابعین اور ان کے بعد اختلاف کرنے والے اہل علم کے اختلاف کی ہے۔ ان میں سے بعض نے جو بعض کا رد کیا ہے، کسی کتاب میں ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، چہ جائیکہ کسی ایک باب میں انہیں جمع کیا جا سکے۔

رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے بعض کا بعض کی طرف رجوع کرنا اور بعض کا بعض کی تردید کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان کی اختلافی آرا میں غلطی اور درستی دونوں کا احتمال پایا جاتا ہے، اسی بنا پر ان میں کوئی بھی یہ نہیں کہتا تھا کہ تم نے جو کہا وہ بھی درست ہے اور ہم نے جو کہا وہ بھی درست ہے اور ہم میں سے ہر ایک

Marfat.com

ستارہ ہے جس سے راہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے، اس لیے ہمارے اختلاف کا کوئی نقصان ہمیں نہیں پہنچے گا۔ جن مسائل میں اختلاف واقع ہوا ہے اور دونوں قول ایک دوسرے سے متصادم ہیں ان میں کوئی ایک ہی قول درست ہے، اگر دونوں متضاد اقوال درست ہوتے تو سلف میں سے بعض نے بعض کے اجتہاد، فیصلے اور فتوے کو غلط قرار نہ دیا ہوتا، اور یہ بات عقل سے بعید ہے کہ دو باہم متضاد چیزیں درست ہوں۔[1]

ابن عبد البر نے علمی اختلافات کے سلسلے میں سلف کا جو نقطۂ نظر نقل کیا ہے اسے پیش کرنے کے بعد درج ذیل امور قابلِ لحاظ ہیں:

۱۔ ابن عبد البر نے جو اختلاف نقل کیا ہے وہ علمی اختلاف کی حقیقت سے تعلق نہیں رکھتا اور نہ اس کی ذات کے اعتبار سے اس پر حکم لگایا جاسکتا ہے بلکہ وہ اختلاف، علمی اختلاف سے متعلق لوگوں کے طرز عمل سے متعلق ہے، اس لیے کہ ان علما میں کوئی ایک عالم بھی ایسا نہیں ہے جس کا دوسرے علما کے ساتھ بہت سے مسائل میں اختلاف نہ ہو، اور ان میں سے کسی سے یہ منقول نہیں کہ انہوں نے ان اختلافات کے وقوع پذیر ہونے کا انکار کیا، بلکہ ان کے اختلاف کا رخ ان اختلافات کے حوالے سے لوگوں کے نقطہ نظر سے ہے جیسا کہ ان سے منقول اقوال و نصوص سے ظاہر ہوتا ہے۔

۲۔ اس سلسلے میں اختلاف کا محل ان اختلافات کے دلائل میں غور کرنے والے عالم کا طرز فکر ہے، نہ کہ عامی آدمی۔

۱۔ جامع بیان العلم وفضلہ ۲: ۸۷- ۸۸

Marfat.com

ابن عبد البر اس قول اول کی تائید میں کہتے ہیں: "اگر کوئی شخص اپنی ذات کی حد تک ان میں سے کسی چیز کے استعمال پر مجبور ہو جائے تو اس کے لیے عام لوگوں کی طرح تقلید جائز ہے۔"

اس سے یہ واضح ہے کہ جو مذکورہ بالا اقوال کو غیر مشروط سمجھتے ہیں اور انہیں بے محل استعمال کرتے ہوئے عام لوگوں کو ان کا مخاطب بنا کر انہیں ایسی چیزوں کا مکلف ٹھہراتے ہیں، جس کی وہ طاقت نہیں رکھتے، ان کا موقف غلط ہے۔

۳۔ اسی طرح جو حضرات اس کے قائل ہیں کہ صحابہ اور علما کے اختلاف میں رحمت اور اس سے گنجائش پیدا ہوتی ہے (اور وہ پہلے قول کے قائلین ہیں)، ان کے اس قول کو اس بات پر محمول کرنا ضروری ہے کہ یہاں گنجائش پیدا کرنے سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے شرعی احکام میں اجتہاد کیا، اس میں ان کے درمیان اختلاف واقع ہوا تو ان کا اجتہاد اور اختلاف، بعد کے علما کے لیے گنجائش کا سبب بنا کہ وہ انہی کی طرح عمل کریں کہ اجتہاد کریں اور احکام کے استنباط میں ان کے درمیان اسی طرح اختلاف ہو جس طرح ان کے اسلاف یعنی صحابہ اور تابعین میں ہوا۔

توسع اور گنجائش کا یہ مفہوم ایسا ہے جو ان لوگوں کے قول سے متصادم نہیں ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اختلافی مسائل میں درست رائے ایک ہی ہو سکتی ہے، اس لیے کہ عالم پر ضروری ہے کہ وہ مختلف اقوال میں اجتہاد کرے اور ان میں سے اس قول کو اختیار کرے جس کے بارے میں اس پر یہ ظاہر ہو کہ وہ حق اور درست ہے خواہ وہ حق کے موافق ہو یا نہ؟ اس مفہوم کی وضاحت قاضی اسماعیل نے کی ہے جیسا کہ ابن عبد البر نے ان سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

Marfat.com

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اصحاب کے اختلاف میں توسع اور گنجائش پیدا ہونے سے مراد اجتہادی رائے میں گنجائش پیدا ہونا ہے، توسع کا یہ مطلب کہ انسان ان میں سے کسی ایک کے قول کا قائل ہو جائے بغیر اس کے کہ اس کے نزدیک اس قول میں حق ہو تو یہ صحیح نہیں ہے، لیکن ان کے اختلاف سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے اجتہاد کیا اور ان میں اختلاف واقع ہو گیا۔[1] ابن عبد البر نے اسماعیل کے اس قول پر اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ اسماعیل کی یہ بات بہت عمدہ ہے۔

۴۔ اس طرح جن حضرات نے اختلاف کو رحمت اور گنجائش پیدا ہونے کا سبب ماننے سے انکار کیا ہے (جیسا کہ دوسرے قول کے قائلین سے منقول ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ مجتہد عالم کے لیے اس کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اجتہاد اور دلیل کی طرف رجوع کیے بغیر ان میں سے کسی کے قول کو اختیار کر لے، کیونکہ یہ مجتہد کا تقلید کرنا ہے جسے جمہور اہل علم نے ناجائز قرار دیا ہے۔[2]

آپس کے اختلاف اور مناظرے میں علمائے کرام کا جو طریق کار رہا ہے اس سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے جس پر ہم نے علما کے بظاہر متعارض اقوال کو محمول کیا ہے، اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک نے اس قول کو اختیار کیا جس تک وہ اپنے اجتہاد کے ذریعے پہنچا ہے۔ اور جسے اس نے پسند کیا، اسی کے ساتھ دوسرے علما کی آرا کا احترام ملحوظ رکھا اگرچہ ان سے اجتہاد میں غلطی ہوئی۔

۱۔ ایضاً ۲: ۸۲

۲۔ غزالی، المستصفی، بولاق، المطبعۃ الأمیریۃ، ۱۳۲۲ھ ۲: ۳۸۴؛ الفقیہ والمتفقّہ ۲: ۶۹

Marfat.com

اسی طرح ان سب نے عوام کو اس بات پر برقرار رکھا کہ وہ اہل علم میں سے جس سے چاہیں پوچھ کر عمل کریں، انہیں اس تنگی میں نہ ڈالا کہ وہ مختلف اقوال میں سے قول حق کو اختیار کریں۔ سفیان ثوری کا وہ قول کیا ہی خوب ہے جو ابھی اوپر گزرا کہ فقہا کا جن مسائل میں اختلاف ہے میں اپنے ساتھیوں میں کسی کو ان میں سے کسی کے قول پر عمل کرنے سے نہیں روکتا۔[1]

۱۔ الفقیہ والمتفقہ ۲: ۶۹

Marfat.com

اختلافی مسائل میں نکیر کا اصول

فقہی اختلاف کے آداب اور اس سے متعلق علما کے نقطۂ نظر کے ساتھ مربوط ایک دوسرا اہم مسئلہ اختلافی مسائل میں نکیر کا اصول ہے۔

مختلف مذاہب کے علما نے مختلف ادوار میں اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے اس پر نظر ڈالنے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ حضرات اس بات پر تقریباً متفق ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وہ منکر جس سے روکا گیا ہے اس کے منکر ہونے پر اتفاق ہو، البتہ بعض حضرات اس میں کچھ تفصیل کے قائل ہیں۔

یہاں اس حوالے سے علما کے چند اقوال نقل کیے جاتے ہیں:

ا۔ ابو نعیم نے امام سفیان ثوریؒ سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

"اگر تم کسی کو دیکھو کہ وہ ایسا عمل کر رہا ہے جس میں علما کا اختلاف ہے اور تمہاری رائے اس کے خلاف ہو تو اسے مت روکو۔"[1]

خطیب بغدادی نے ان سے یہ بھی نقل کیا ہے (جو پہلے ذکر ہو چکا ہے) کہ:

"جن مسائل میں فقہا کا اختلاف ہے ان میں، میں اپنے ساتھیوں کو کسی ایک قول پر عمل کرنے سے نہیں روکتا۔"[2]

ا۔ ملاحظہ ہو: ابو نعیم، الحلیة، بیروت، دارالکتاب العربی (۱۳۶۹ھ) ۶: ۳۸؛ دیکھیے: سفیان ثوری کی سوانح پر میرا رسالہ (الإمام سفیان الثوری حیاته العلمیة والعملیة، قاہرہ، دارالسلام، ۱۳۹۲ھ)، ص ۹۸

۲۔ الفقیه والمتفقه ۲: ۶۹

Marfat.com

۲۔ ابن مفلح نے الآداب الشرعیة میں امام احمد کے بارے میں اس عنوان: لا إنكار على من اجتهد فيما يسوغ فيه خلاف في الفروع (جن فروعی مسائل میں اختلاف کی گنجائش ہے ان میں جو شخص اجتہاد کرے اس پر نکیر نہیں کی جائے گی) کے تحت جو کچھ نقل کیا ہے وہ درج ذیل ہے:

امام احمدؒ نے کہا: فقیہ کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ لوگوں کو کسی ایک مذہب کی پیروی کا پابند بنائے اور ان پر سختی کرے۔ ابن مفلح نے امام حمد سے ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ مجتہد پر نکیر نہیں کی جاتی بلکہ مقلد پر کی جائے گی۔ اسی طرح قاضی ابو یعلیٰ سے الأحكام السلطانية میں نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا:

جس مسئلے میں اختلاف ضعیف ہو اور وہ کسی ایسی ممنوع شے کا ذریعہ بن جائے جس کے ممنوع ہونے پر سب کا اتفاق ہو، مثلاً "ربا صریح" تو اس سے روکنا محتسب کا کام ہے، اس لیے کہ وہ اس کے دائرہ اختیار میں ہے۔[1]

اگر امام احمد کی روایات کو قاضی ابو یعلی کی ذکر کردہ صورت پر محمول کیا جائے تو مختلف روایات و اقوال کے درمیان تطبیق ممکن ہے، چنانچہ اختلافی مسائل میں سے صرف اس مسئلے میں نکیر کی جائے گی جس میں اختلاف ضعیف ہو مثلاً ربا صریح کے حکم کے بارے میں اختلاف، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے جسے امام ابن تیمیہ نے اس سلسلے میں ذکر کیا ہے۔

۱۔ ابن تیمیہ، الآداب الشرعیة، مکتبۃ الریاض الحدیثۃ (۱۳۹۱ھ) ۱: ۱۸۶؛ سفارینی، محمد بن احمد بن سالم حنبلی، غذاء الألباب، مکتبۃ الریاض الحدیثۃ (۱۳۹۱ھ) ۱: ۲۱۸؛ ابو یعلی، محمد بن حسین الفراء، الأحكام السلطانية، مصر، مطبعۃ البابی الحلبی، ص ۲۹۷

Marfat.com

۳۔ چنانچہ ابن مفلح نے الآداب الشرعیة میں اور سفارینی نے غذاء الألباب میں ان سے جو کچھ نقل کیا ہے اس کے الفاظ درج ذیل ہیں:

ان کا یہ کہنا کہ اختلافی مسائل میں نکیر نہیں کی جائے گی، اس لیے کہ نکیر جس چیز پر کی جائے گی وہ قول ہو گا یا عمل۔

جہاں تک قول کا تعلق ہے تو قول اگر سنت یا اجماع قدیم کے خلاف ہو تو بالاتفاق اس پر نکیر (ٹوکنا) ضروری ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو اکثر سلف صالحین اور فقہا جن کے نزدیک درست رائے ایک کی ہو سکتی ہے اس پر نکیر کی جائے گی (یعنی اس کے ضعف کو بیان کیا جائے گا)۔

نیز نکیر اگر عمل سے متعلق ہو تو اگر وہ عمل سنت یا اجماع کے خلاف ہو تو نکیر کے درجات کے لحاظ سے اس پر نکیر بھی واجب ہے۔

لیکن اگر اس مسئلے میں سنت یا اجماع نہ ہو اور اس میں اجتہاد کی گنجائش ہو تو کسی عمل کرنے والے پر نکیر نہیں کی جائے گی خواہ وہ مجتہد ہو یا مقلد، اس کے بعد وہ اس مسئلے میں واقع ہونے والے اختلاف اور اشتباہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اشتباہ اس وجہ سے پیدا ہوا کہ قائل یہ سمجھتا ہے کہ اختلافی مسائل، اجتہادی مسائل ہیں جیسا کہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے، لیکن اس سلسلے میں درست بات جس کے ائمہ قائل ہیں وہ یہ ہے کہ اجتہادی مسائل (بشرطیکہ ان میں کوئی ایسی دلیل نہ ہو جس پر عمل کرنا واجب ہو مثلاً کوئی صحیح حدیث جس کے معارض کوئی دوسری صحیح حدیث نہ ہو) تو اس صورت میں ان میں اجتہاد جائز ہے، اس لیے کہ ایک درجے کے دلائل میں تعارض ہے یا ان میں دلائل مخفی ہیں۔

Marfat.com

کسی مسئلے کو قطعی کہنے میں ان مجتہدین پر طعن و تنقید نہیں جن کا نقطہ نظر اس کے خلاف ہو، مثلاً وہ سارے مسائل جن میں سلف کا اختلاف ہے، جبکہ ہمیں یقین ہو کہ ان میں سے ایک قول ہی صحیح ہے۔ اسی طرح وہ حاملہ عورت جس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہو وہ وضع حمل کے حساب سے عدت گزارے گی اور جماع میں اگر انزال نہ ہو تو بھی غسل واجب ہو گا اور ربا الفضل اور نکاح متعہ حرام ہے۔ انہوں نے اس نوعیت کے اور بھی بہت سے مسائل ذکر کیے ہیں۔[1]

سفارینیؒ ابن تیمیہؒ کا یہ اقتباس نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

علامہؒ نے ہمیں سمجھایا کہ اختلافی مسائل میں عدمِ نکیر اس وقت چلے گا جبکہ وہ قرآن وسنت کی کسی نص صریح اور اجماع قدیم کے خلاف نہ ہو۔ اگر اس کے خلاف ہو تو پھر نکیر کی جاسکتی ہے۔[2]

ان کی بات سے یہ چیز سامنے آتی ہے کہ اگر دو حدیثوں میں تعارض ہو تو دو صورتوں سے خالی نہیں؛ یا، تو وہ دونوں صحت میں ایک دوسرے سے قریب ہوں گی؛ اس طور پر کہ دونوں پر عمل کرنے کی گنجائش ہو گی اور دونوں دلیل بننے کی صلاحیت رکھتی ہوں گی یا نہیں؟ اگر دلیل بننے کی صلاحیت رکھتی ہوں تو پھر وہ ان اجتہادی مسائل میں سے ہیں جن میں نکیر کی گنجائش نہیں، بصورت دیگر نکیر کی گنجائش ہے، چنانچہ کثرت سے شطرنج کھیلنے والے اور تعدیلِ ارکان چھوڑنے والے پر نکیر کی جائے گی، اس لیے کہ تعدیلِ ارکان اور کثرت سے شطرنج کھیلنے کے سلسلے میں صحیح حدیث موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۔ الآداب الشرعیة ۱: ۱۸۶؛ غذاء الألباب ۱: ۲۱۹

۲۔ غذاء الألباب ۱: ۲۱۹- ۲۲۰

Marfat.com

۴۔ علامہ ابن رجب حنبلی جامع العلوم والحکم میں لکھتے ہیں:

وہ منکر جس پر نکیر کرنا واجب ہے اور یہ وہ ہے جس کے منکر ہونے پر اجماع ہو، لیکن جس کے منکر ہونے میں اختلاف ہو تو ہمارے بعض اصحاب کہتے ہیں کہ اگر کوئی مجتہد یا کسی مجتہد کا جائز طور پر تقلید کرنے والا اس پر عمل کرے تو اس پر نکیر کرنا لازم نہیں ہے۔ قاضی ابو یعلیٰ نے الأحکام السلطانیة میں اس کو بھی مستثنیٰ کہا ہے جس میں اختلاف ضعیف ہو۔[1]

پھر کہتے ہیں: امام احمدؒ سے یہ منقول ہے کہ شطرنج کھیلنے والے پر نکیر کی جائے گی اور قاضی (ابو یعلیٰ) نے اس سے وہ شخص مراد لیا ہے جو اجتہاد یا جائز تقلید کے بغیر کھیلے۔ قاضی کی یہ رائے محل نظر ہے، اس لیے کہ ان سے صراحت کے ساتھ منقول ہے کہ نبیذ (جس کے بارے میں اختلاف ہے اس کے) پینے والے پر حد جاری کی جائے گی اور حد قائم کرنا نکیر کا آخری درجہ ہے (حالانکہ ان کے نزدیک اسے اس کی وجہ سے فاسق قرار نہیں دیا جائے گا) اس سے پتا چلا کہ وہ ہر اس مختلف فیہ چیز پر نکیر کرتے ہیں (جس میں اختلاف ضعیف ہو)، اس لیے کہ حدیث اس کی حرمت پر دلالت کرتی ہے، لیکن اگر اس کا مرتکب تاویل کرتا ہو تو اس کی عدالت ساقط نہ ہوگی۔ واللہ أعلم۔ اسی طرح امام احمد سے اس شخص پر نکیر کرنا بھی منقول ہے جو اپنی نماز ٹھیک طرح سے ادا نہ کرتا ہو اور رکوع و سجود سے اٹھ کر اپنی پیٹھ سیدھی نہ کرتا ہو، حالانکہ اس کے ثبوت میں بھی اختلاف ہے۔[2]

۱۔ الأحکام السلطانیة، ص۲۹۷

۲۔ جامع العلوم والحکم، ص۲۸۴

Marfat.com

۵۔ ابن قدامہ کہتے ہیں کہ کسی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ دوسرے کو اپنے مذاہب پر عمل کرنے کی وجہ سے تنقید کا نشانہ بنائے، اس لیے کہ اجتہادی مسائل میں نکیر نہیں ہے۔[1]

۶۔ حجۃ الاسلام امام غزالی إحیاء علوم الدین میں "حسبہ" پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "قابل احتساب (مؤاخذہ) چیزیں ہر وہ برائی ہے جو محتسب کو تجسس کے بغیر نظر آتی ہو اور اجتہاد کیے بغیر اس کا برائی ہونا معلوم ہو"، پھر انہوں نے منکر (برائی) کی چوتھی شرط پر کلام کرتے ہوئے کہا: "یہ کہ اس کا منکر ہونا بغیر اجتہاد کے معلوم ہو جائے، تو ہر وہ چیز جو اجتہاد کا محل ہے اس میں احتساب و مواخذہ نہیں کیا جائے گا، لہٰذا حنفی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ شافعی پر اس کے گوہ، بجو اور متروک التسمیہ ذبیحہ کے کھانے پر نکیر کرے اور نہ کسی شافعی کو اس بات کا حق ہے کہ وہ حنفی پر غیر نشہ آور نبیذ کے پینے یا ذوی الأرحام کی میراث لینے یا حق شفعہ جوار کی وجہ سے لیے ہوئے گھر میں بیٹھنے پر نکیر کرے یا ان کے علاوہ دیگر اجتہادی مسائل میں۔[2]

۷۔ نوویؒ صحیح مسلم کی حدیث: من رأی منکم منکراً کی شرح میں لکھتے ہیں:

پھر وہ شخص بھلائی کا حکم دے گا اور برائی سے روکے گا جو ان باتوں سے واقف ہو، اور اس حکم کی حیثیت مامور بہ کے بدلنے سے بدلتی رہتی ہے، اگر وہ ایسے امور سے متعلق ہے جس کا واجب ہونا ظاہر یا حرام ہونا مشہور ہے مثلاً نماز، روزہ اور زکاۃ کی فرضیت، زنا اور شراب وغیرہ کی حرمت تو ہر مسلمان انہیں جانتا ہے؛

۱۔ ابن مفلح، الآداب الشرعیۃ، مکتبۃ الریاض الحدیثۃ، ۱۳۹۱ھ ۱: ۱۸۶ ومابعد

۲۔ غزالی، ابو حامد محمد بن محمد، إحیاء علوم الدین، بیروت، دار المعرفۃ ۲: ۳۲۴

Marfat.com

لیکن اگر اس کا تعلق دقت نظر کے متقاضی افعال و اقوال اور اجتہادی مسائل سے ہے تو عام لوگ اس میں دخل اندازی نہیں کر سکتے۔ ان پر نکیر کرنے کا حق اہل علم کو ہے، وہی اس کے منکر ہونے کا تعین کر سکتے ہیں۔ پھر علما صرف انہی امور پر نکیر کریں گے جن پر اجماع ہے جبکہ دقت نظر کے متقاضی اختلافی مسائل میں نکیر نہیں کی جاسکتی، اس لیے کہ ایک مذہب کی رو سے ہر مجتہد کی رائے درست ہے اور یہی بہت سے محققین کے نزدیک پسندیدہ ہے اور دوسرے مذہب کی رو سے درستگی تک پہنچنے والا ایک ہے اور جو غلطی پر ہے وہ ہمارے نزدیک متعین نہیں ہے۔ اور اس پر گناہ نہیں۔

لیکن اگر اختلاف سے نکلنے کے لیے نصیحت کے طور پر اسے نرمی سے دعوت دے تو یہ مستحسن اور بہتر ہے۔

اہل علم اس پر متفق ہیں کہ اختلاف سے نکلنے کی ترغیب دی جائے گی۔ اگر اختلاف کی وجہ سے کسی سنت میں کوئی خلل واقع نہ ہو یا کسی دوسرے اختلاف میں پڑنے کا اندیشہ نہ ہو۔

ابوالحسن ماوردی نے الأحکام السلطانیة میں کہا ہے کہ اہل علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ جسے بادشاہ نے محتسب کی ذمہ داری دی ہو اور وہ اہل اجتہاد میں سے ہو تو کیا وہ یہ کر سکتا ہے کہ وہ فقہا کے اختلافی مسائل میں لوگوں کو اپنے مسلک کی پیروی کرنے پر مجبور کرے؟ یا وہ دوسرے کے مذہب کو بدلنے کا حق نہیں رکھتا؟ زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ وہ مذہب تبدیل نہیں کرائے گا جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا اس لیے کہ فروع میں صحابہؓ، تابعینؒ اور ان کے بعد کے لوگوں

Marfat.com

میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور کسی محتسب وغیرہ نے دوسرے مذہب والے پر نکیر نہیں کی۔

اسی طرح مفتی اور قاضی کو یہ حق نہیں کہ وہ ان لوگوں پر اعتراض کرے جو الگ مذہب رکھتے ہوں، اگر ان کا اختلاف کسی نص یا اجماع یا قیاس جلی کے خلاف نہ ہو۔[1] واللہ اعلم

۸۔ ملا علی قاری نے نووی کے مذکورہ اقتباس کا ایک حصہ نقل کر کے اس پر صاد کیا ہے۔[2]

۹۔ ابن حجر مکی نے بھی نووی کے کلام کا کچھ حصہ نقل کر کے اس کی تائید کی ہے، اور قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "جس رائے کا کوئی امام قائل ہو اور شریعت میں اس کی کوئی سی دلیل ہو تو اس کے خلاف رائے رکھنے والے کے لیے جائز نہیں کہ اس پر نکیر کرے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔"[3]

مذکورہ بحث سے یہ بات واضح ہے کہ اہل علم اصولی طور پر اس مسئلے پر متفق ہیں، اور وہ یہ کہ مخالف رائے رکھنے والے پر نکیر نہیں کی جائے گی اگر اس کا اختلاف کسی اجتہادی معاملے میں ہے اگرچہ بعض حضرات نے اختلاف قوی اور اختلاف ضعیف کے درمیان فرق کیا ہے۔

۱۔ نووی، ابوزکریا محیی الدین یحییٰ بن شرف، المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج، بیروت، دار إحیاء التراث العربی ۲: ۲۳-۲۴

۲۔ ملا علی قاری بن سلطان نور الدین، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، مکتبہ بمبئی ۵: ۳-۴

۳۔ ابن محمد الہیثمی، المکی، فتح المبین فی شرح الأربعین، قاہرہ، دار احیاء الکتب العربیۃ، ص ۲۶۴

Marfat.com

ہمارا رجحان جس طرف ہے اور مختلف اقوال کے درمیان تطبیق کے بعد جسے ہم بہتر سمجھتے ہیں اور اختلافی مسائل میں نتیجے کے اعتبار سے جو زیادہ سلامتی کی راہ ہے وہ یہ ہے کہ ہم مسئلے کی اس طرح درجہ بندی کریں جو مختلف فیہ مسئلے کی اور منکر کی نوعیت سے تعلق رکھتی ہو۔ چنانچہ ہم کہتے ہیں:

ا۔ مختلف فیہ اجتہادی مسائل میں اصل نکیر نہ کرنا ہے، اس سے درج ذیل صورتیں مستثنیٰ ہیں:

(الف) جس چیز میں اختلاف تاریخی ہو اور اس کا باقی رہنا درست نہ ہو، مثلاً صدر اول میں سلف کا ربا الفضل یا نکاحِ متعہ کے حکم میں اختلاف، جس کے بارے میں مخالف رائے رکھنے والوں کا جمہور کے قول کی طرف رجوع کرنا منقول ہے، یا مخالف قول کو شاذ قرار دیا گیا ہے، تو اس طرح کے مسائل میں نکیر کرنا اپنے مراتب اور معروف شرائط کے ساتھ ضروری ہے۔

(ب) لیکن جس مسئلے میں اہلِ علم کے نزدیک اختلاف ضعیف ہو، اس میں دو صورتوں کے درمیان فرق کیا جانا چاہیے: پہلی صورت وہ ہے جہاں ضعف شدید ہو اور وہ کسی ثابت شدہ شرعی نص سے متصادم ہو اور کسی ضعیف شبہے کی بنیاد پر کوئی اس کا قائل ہو (مثلاً گانا بجانا اور موسیقی) تو اس پر نکیر کی جائے گی۔

دوسری حالت وہ ہے جہاں مسئلہ اجتہادی ہو اور اس میں سرے سے نص نہ ہو تو کسی قول پر عمل کرنے والے پر نکیر نہیں کی جائے گی، مگر اختلاف سے نکل آنے کے لیے نرمی کے ساتھ اسے نصیحت کی جائے گی، اس لیے کہ اس طرح کا مسئلہ اگرچہ بہت سے اہلِ علم کے نزدیک ضعیف ہے لیکن دوسرے اہلِ علم کے نزدیک قوی ہو سکتا

Marfat.com

ہے، اور اس میں ہمارے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ معتبر ائمۂ کرام میں سے کسی ایک کا اجتہاد ہے ورنہ تو نزاع اور اختلاف واقع ہو جائے گا اور نزاع بڑھ جائے گا، اس لیے کہ یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں لوگوں کی سمجھ اور رائے میں فرق ہو سکتا ہے۔

۲۔ یہ بات جسے ہم نے نمبر ا میں ذکر کیا ہے وہ اس عالم کا موقف ہے جو مسئلہ میں واقع ہونے والے اختلاف سے واقف ہو، لیکن وہ عامی جو ضعیف اور غیر ضعیف اقوال میں فرق نہیں کر سکتا تو اس کے لیے یہ درست نہیں کہ وہ مختلف فیہ مسائل میں سے کسی مسئلے میں نکیر کرے، الا یہ کہ وہ کسی قابلِ اعتماد عالمِ دین سے مسئلے کا حکم جان لے یا یہ کہ اس طرح کے مسائل پر اہل علم کا نکیر کرنا مشہور ہو، تو ایسی صورت میں اس کا انکار علما کی تقلید ہو گی، یعنی ایسی تقلید کہ اس جیسے آدمی کے لیے اس تقلید کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں۔

اس پر نکیر کے لیے یہ وجہ جواز کافی نہیں کہ وہ دوسروں کو اپنے عمل یا کسی عالم کے فتویٰ کے خلاف عمل کرتا ہوا دیکھے، اس لیے کہ اس طرح کے بہت سے اختلافی اور اجتہادی مسائل ہیں جنہیں بہت سے عامی لوگ ایسے قطعی مسائل تصور کرتے ہیں کہ ان میں اختلاف کی گنجائش ہی نہ ہو۔

اس طرح ایک بڑے خطرے کا سدِباب ہو سکتا ہے اور مسلمانوں سے اس اختلاف و نزاع کی تباہ کاریاں ٹل سکتی ہیں جو ماضی میں بسا اوقات جنگ و جدل اور خون ریزی کا سبب بنتے رہے ہیں۔

Marfat.com

فصل چہارم

اسبابِ اختلاف کا ارتقا

اسبابِ اختلاف: عہدِ رسالت سے عہدِ صحابہ تک

فکری امور و معاملات جن سے فقہی مسائل کا استخراج ہوتا ہے ان میں اختلاف ہونا ایک فطری چیز ہے کیونکہ لوگوں کا شعور و احساس ان کی عقل و فہم یہ سبھی چیزیں قدرتی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ بنیاد تسلیم کر لینے کے بعد لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ عہد رسالت و خلافت راشدہ میں کچھ صحابہ کرام کے درمیان بھی اختلافات پیدا ہوئے اور تاریخی واقعات ان کے گواہ بھی ہیں جن سے انکار دین کی کوئی خدمت نہیں، اور جن کے ذکر سے اس مثالی دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور نہ ہی باہمی اختلافاتِ صحابہ کرامؓ سے ان کی نیتوں کی صداقت مجروح ہوتی ہے، بلکہ ان سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ یہ دین فطری اور قابل عمل ہے۔ حقائق زندگی پر اس کی گہری نظر ہے اور انسانی تقاضوں کو سامنے رکھ کر ہی ان کے ساتھ اس کے معاملات ہوا کرتے ہیں۔ اور تخلیق فطرت کے مختلف عوامل و اسباب بھی جابجا اثر انداز ہیں۔ لیکن مومن کے قلب و روح کے لیے یہ چیز اطمینان بخش ہے کہ یہ اختلاف ضعفِ عقیدہ یا دعوتِ رسول ﷺ کی صداقت میں کسی شک کے سبب نہیں پیدا ہوئے، بلکہ ان تمام حضرات کا مقصود تلاشِ حق اور اصابت آرا و احکام ہی ہے۔

چونکہ رسول اللہ ﷺ ان احکام و مسائل کا سرچشمہ تھے، اس لیے اختلاف کی عمر اتنی ہی ہوتی تھی کہ وہ اس راہ پر لگا دے جس کی منزل رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ان

Marfat.com

واقعات میں ہم دیکھتے ہیں کہ سارے اسباب اختلاف فہم نص میں داخل ہیں۔ لغوی یا اجتہادی وجوہ سے اس میں فرق پڑ جایا کرتا تھا یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی تفسیر سمجھنے میں لغوی یا اجتہادی اعتبار سے آپس میں اختلاف ہو جایا کرتا تھا۔ ان اسباب کے پیچھے ان کی نیت ہرگز یہ نہیں تھی کہ اختلاف کے بیج اگائیں جس کی نشوونما کی کوشش میں منافقین ہمیشہ لگے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچتے ہی یہ اختلافات ختم ہو جاتے یا انہیں ایسی کوئی نص مل جائے جو بعض کو معلوم ہو اور کچھ اس ناواقف ہوں تب بھی یہ اختلافات دم توڑ دیتے کیونکہ فطرتِ سلیم حق بات جہاں پاتی ہے فوراً اسے قبول کر لیتی ہے۔

اسباب اختلاف کا عہد بہ عہد منتقل ہونا بھی فطری ہے، کیونکہ ایسی رکاوٹیں پیدا کرنی مشکل ہیں جن سے وہ ختم ہو سکیں کچھ ایسے معاملات بھی پیش آتے گئے جن کے سبب سے اختلاف کی چنگاری بھڑکتی رہی۔

خلیفہ ثالث سیدنا عثمان بن عفانؓ کی شہادت کے بعد بلادِ اسلامیہ میں ایک طوفان برپا ہو گیا جس کے نتیجے میں کچھ ایسے حادثات رونما ہوئے جنہوں نے دائرہ اختلاف میں نئی نئی چیزیں شامل کر دیں۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ ہر شہر اور ملک کے مسلمان وضع و تلبیس کے خوف سے صرف اسی سنت رسول ﷺ پر عمل کرتے جو انہیں پہنچتی۔

کوفہ وبصرہ کے دبستان فقہ میں سیاسی افکار کو کچھ خوش گوار ماحول ملا جس سے کئی ایک فرقے جیسے خوارج، شیعہ، مرجئہ وغیرہ[1] کو فروغ ملا، اور معتزلہ و جہمیہ وغیرہ اہل

۱۔ مرجئہ، وہ فرقہ ہے جو الإرجاء في الإيمان کا قائل ہے۔ إرجاء لغت میں تاخیر کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں ایمان سے عمل کو مؤخر کرنا ارجاء ہے۔ مرجئہ کا اعتقاد ہے کہ ایمان کے ساتھ معصیت مضر نہیں۔ جیسے کفر کے

Marfat.com

زیغ وضلال سامنے آئے۔ جتنے فرقے ہوئے اتنے ہی مناہج فکر و عقل بھی بڑھتے گئے اور ہر فرقہ کے کچھ مخصوص اصول وضوابط اور ان کا اپنا نقطۂ نظر بن گیا جس سے وہ نصوص شارع اور مصادر شرعیہ کی تفسیر اور نئے نئے مسائل میں اپنے موقف کی توضیح کرنے لگا۔ اس لیے ضرورت پیش آئی کہ وحی الٰہی کی روشنی میں کچھ قیود وضوابط وضع کیے جائیں اور استنباطِ احکام کے اسالیب و مناہج کی تعیین اور اختلاف کا جواز کن کن چیزوں میں ہے اس کی تحدید کر دی جائے۔

اللہ کا فضل وکرم ہی ہے کہ اس نے مجتہدین کے فقہی اختلاف کو دائرہ جواز میں رکھا ہے، کیونکہ آیات واحادیث کے احکام بتلانے کے لیے شارع نے جو تفصیلی دلائل متعین فرمائے ہیں، ان کے ذریعہ حکم واقعہ کی پہچان کو فقہ کہا جاتا ہے اور فقیہ کبھی حکم شارع کو صحیح طریقے سے سمجھتا اور اس کے مطابق نتیجہ نکالتا ہے اور کبھی اس سے خطا بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن دونوں حالتوں میں اس کی صرف اتنی ذمہ داری ہے کہ صحیح حکم تک پہنچنے کے لیے اپنی ساری ذہنی و عقلی صلاحیت واستعداد استعمال کرے۔ اگر حکم شارع تک نہیں پہنچ سکا، جب بھی اس کی حقیقت وغایت سے قریب تر وہ پہنچ ہی جائے گا اور ایسے حال میں دو شرطوں کے ساتھ یہ اختلاف جائز بھی ہو گا:

۱۔ ہر فریق کے پاس قابل حجت دلیل ہو اور اگر کوئی دلیل نہ ہو تو وہ بالکل ساقط الاعتبار ہو گا۔

ساتھ طاعت مفید نہیں۔ ان کا یہ عقیدہ جمہور اہل قبلہ کے خلاف ہے۔ کل پانچ فرقے ان کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ ان کے عقائد اور فرقوں کی تفصیل ان کتابوں میں دیکھیں: التبصير في الدين، ص۹۷؛ رازی، اعتقادات الفرق ۱۰۷؛ عضد الدین ایجی، المواقف، ص۴۲۷

Marfat.com

۲۔ مسلک مخالف تسلیم کر لینے سے محال یا باطل کی راہ پر نہ لگ جائے۔ اگر ایسا ہو تو ابتدا ہی وہ باطل ہو جائے گا اور کسی حال میں کسی کو اس کے ذکر کا بھی حق نہیں۔

ان دو امور سے "اختلاف" اور "خلاف" کا فرق واضح ہے۔

مذکورہ بالا دونوں شرطیں جس میں پائی جائیں وہ اختلاف ہے جو فکر و اجتہاد کا مظہر ہے اور اکثر اس کے اسباب معقول ہوا کرتے ہیں۔ جس میں ایک یا دونوں شرطیں نہ پائی جائیں وہ خلاف ہے جو عناد و نفسانیت کا مظہر ہے اور اس میں کوئی معقول وجہ نہیں ہوتی۔

عہد فقہا میں اسباب اختلاف

وہ فقہا جن کے مسالک پر امت کا اجماع ہے، انہوں نے سابقہ دونوں شرطوں کی ہمیشہ پابندی کی۔ لیکن اس زمانے میں لوگوں نے اسباب اختلاف کے تعین میں واضح اختلاف کیا ہے۔ ان اسباب کی کثرت بھی ظاہر کی جاتی ہے اور اعتدال بھی۔ اس کے باوجود انہیں مندرجہ ذیل امور سے وابستہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ لغت

کلام شارع میں جب کوئی لفظ مشترک آئے جس کی وضع چند مختلف معانی کے لیے ہو جیسے لفظ عین جس کے کئی ایک معانی ہیں مثلاً آنکھ، چشمہ، خالص سونا، نگہبان وغیرہ۔

یہ لفظ جب کلام شارع میں بغیر کسی قرینہ کے ہو تو اس کے وضعی معانی برابر ہوں گے اور ہر ایک مراد ہو سکتے ہیں۔ اس لیے مجتہدین کا اس میں اختلاف ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ کبھی معانی کے لیے عام ہے یا کسی ایک کے لیے یہاں خاص ہے۔

Marfat.com

لفظ القُرء جو اس آیت میں ہے اس سے شارع کی مراد کے سلسلے میں علما کا اختلاف ہے: ﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلاثَةَ قُرُوءٍ﴾ [البقرة۲: ۲۲۸] (مطلّقہ عورتیں تین حیض تک اپنی جانوں کو روکے رکھیں)۔

القرء جس کے معنی طُہر بھی ہے اور حیض بھی۔ اس لیے مطلقہ کی عدت حیض سے مانی جائے گی یا طہر سے۔ اس میں علما کا اختلاف ہو گیا۔ علماے حجاز نے کہا کہ تین طہر ہے اور علماے عراق نے کہا کہ تین حیض۔[1]

لفظ کبھی دو طرح سے استعمال ہوتا ہے۔ ایک حقیقی دوسرا مجازی۔ اس لیے اس میں اختلاف ہو جاتا ہے کہ اس نص میں اس کا استعمال حقیقی ہے یا مجازی۔

پہلے تو خود شارع کے الفاظ میں مجاز کے ہونے پر بھی اختلاف ہوا۔ اکثر نے اسے جائز قرار دیا اور کچھ تھوڑے لوگوں نے جیسے ابو اسحاق اسفرائنی اور امام ابن تیمیہ نے اس کی نفی کی ہے۔

منکرین مجاز کہتے ہیں کہ اصل وضع جس کے لیے ہوئی ہو اسے چھوڑ کر کوئی دوسرا معنٰی مراد لینا مجاز ہے۔ جیسے اسد کہہ کر اس سے بہادر شخص مراد لیا جائے اور نصوص شارع احکام شرعیہ بیان کرنے کے لیے وارد ہیں۔ اس لیے ان کا حقیقی معنٰی کی بجاے کوئی مجازی معنی لینا بیانِ مقصود کے منافی ہے۔ ہمیں اس موضوع سے کوئی بحث نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ جمہور علما شارع کے الفاظ میں مجاز کے وقوع پذیر ہونے کے قائل ہیں۔ ابن قدامہ اور دیگر علماے اصول کی راے ہے کہ ایسا انکار مکابرہ (ہٹ دھرمی) ہے۔[2]

۱۔ تفسیر قرطبی ۳: ۱۱۳؛ ابن قدامہ، المغني ۹: ۷۷

۲۔ ابن قدامہ، روضة الناظر، ص ۳۵

Marfat.com

کلامِ شارع سمجھنے میں اسی لیے علما کا اختلاف اور حقیقت و مجاز کا تردد پیدا ہو جاتا ہے۔ کسی مفرد لفظ میں دو معانی کا احتمال ہے تو اسے کچھ حقیقی معنیٰ پر محمول کر لیتے ہیں اور کچھ اس کا معنیٰ مجازی مراد لیتے ہیں۔ جیسے لفظ المیزان ہے اس کا حقیقی معنی ترازو ہے لیکن مجازاً عدل کے لیے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ. أَلا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ. وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ﴾ [الرحمن۵۵: ۷- ۹] (آسمان کو بلند کیا اور میزان قائم کیا کہ اس میں تم بے اعتدالی نہ کرو۔ انصاف کے ساتھ تولو اور وزن نہ گھٹاؤ)۔

اور آیت کریمہ: ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ [الحدید۵۷: ۲۵] (بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل کے ساتھ بھیجا۔ ان کے ساتھ کتاب اور عدل کی ترازو اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں)۔

اس میں المیزان ترازو کے معنیٰ میں ہے۔[1]

اسی طرح عروض کو میزان الشعر اور نحو کو میزان الکلام[2] کہا جاتا ہے۔ اسی طرح "سلسلہ" اور اس طرح کے دیگر الفاظ۔

کبھی ترکیب میں بھی مجاز ہوتا ہے، جیسے اس آیت میں ہے: ﴿يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا﴾ [الاعراف۷: ۲۶] (اے بنی آدم! ہم نے تمہارے لیے ایک ایسا لباس اتارا جو تمہاری شرم کی چیزیں چھپائے اور لباسِ فاخرہ)۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر ۴: ۲۷۰

۲۔ البطلیوسی، الإنصاف في التنبيه على المعاني والأسباب ...، ص۵۵

Marfat.com

یہ بدیہی بات ہے کہ لباس اور پَر آسمان سے نہیں اترتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بارش برسائی، سبزہ اگایا، حیوان کو پیدا فرمایا، اسے بال اور اون کا لباس پہنایا، انسانوں کے لباس کے لیے روئی اور ریشم یہ ساری چیزیں اگائیں۔ اس لیے سبب یعنی پانی جس سے اللہ تعالیٰ نے ہر زندہ چیز پیدا فرمائی اور اس کی جگہ مسبب یعنی لباس کی نسبت فرما دی۔

یہ معروف قاعدہ ہے کہ صیغۂ افعل امر کے لیے اور لا تفعل نہی کے لیے ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ امر وجوب کے لیے اور مطلق نہی تحریم کے لیے ہے۔ دونوں صیغوں کا یہی استعمال حقیقی ہے۔ لیکن اس حقیقی معنیٰ کے علاوہ دوسرے معانی بھی ہیں۔

امر استحباب کے لیے بھی آتا ہے جیسے اس آیت میں ہے: ﴿فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا﴾ [النور۲۴: ۳۳] (تو انہیں لکھ دو اگر ان میں کچھ بھلائی جانو)۔

ارشاد و راہنمائی کے لیے بھی ہے، جیسے: ﴿وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ﴾ [البقرۃ۲: ۲۸۲] (اور دو گواہ کرلو)۔ اور ﴿إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾ [البقرۃ۲: ۲۸۲] (تم جب کسی وقت مقرر تک کسی قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لو)۔

تہدید کے لیے بھی ہے، جیسے: ﴿اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ﴾ [فصلت۴۱: ۴۰] (جو جی میں آئے کرو)۔[1]

نہی تحریم کے علاوہ دوسرے معانی جیسے کراہت و تحقیر کے لیے بھی ہے۔ جیسے اس آیت میں ہے: ﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ﴾ [الحجر۱۵: ۸۸] (اپنی آنکھ اٹھا کر ان جوڑوں کو نہ دیکھو جنہیں ہم نے کچھ چیزوں سے بہرہ ور کیا)۔

۱۔ المحصول ۱: ۳۲۵ وما بعد۔ صیغۂ أفعل کے پندرہ معنیٰ بتلائے گئے ہیں۔

Marfat.com

اسی طرح ارشاد و رہنمائی کے لیے بھی ہے: ﴿لا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ﴾ [المائدۃ۵: ۱۰۱] (ایسی باتیں نہ پوچھو جو تم پر ظاہر کی جائیں تو تمہیں بری لگیں)۔[۱]

امر صیغۂ خبر کے لیے اور نہی صیغۂ خبر و نفی کے لیے ہے۔ نصوص سے احکامِ شرعیہ کے استنباط، مناہج و طرق اور اختلافِ فقہا میں ان معانی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ کبھی احوال کلمہ کے اختلاف کی وجہ سے معنیٰ میں نہیں مگر فہم نص میں علما کا اختلاف ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿وَلا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلا شَهِيدٌ﴾ [البقرۃ۲: ۲۸۲] (کسی لکھنے والے کو ضرر دیا جائے نہ گواہ کو [یا نہ لکھنے والا ضرر دے نہ گواہ])۔

بعض کا خیال ہے کہ کاتب و شہید سے نقصان پہنچانا مراد ہے اس طرح کہ لکھنے والا وہ بات لکھ دے جو اسے املانہ کرائی گئی ہو اور شاہد خلاف واقعہ شہادت دے دے۔ ان کی دلیل سیدنا ابن عباسؓ کی یہ قراءت ہے: وَلا يُضَارِر كاتبٌ وّلا شَهِيدٌ...

دوسرے فریق کا خیال ہے کہ اس سے کاتب و شہید کو ضرر پہنچنا مراد ہے وہ اپنے کام اور مصروفیات سے روک دیے جائیں اور غیر مناسب وقت میں انہیں کتابت و شہادت کا مکلف بنا دیا جائے۔ ان حضرات کی دلیل سیدنا ابن مسعودؓ کی یہ قراءت ہے: وَلا يُضَارر كاتبٌ وّلا شَهِيدٌ

جب لغتِ تمیم میں لفظ مدغم ہو تو دونوں احتمالات ہوتے ہیں کہ فعل معلوم کے لیے بھی ہو اور مجہول کے لیے بھی۔ اس وجہ سے یہ اختلاف رونما ہوا اگرچہ ادغام نہ کرنا حجاز کا لہجہ ہے۔[۲]

۱۔ مرجع سابق ۴۶۹؛ آمدی، الإحکام ۲: ۱۸۷

۲۔ التنبیه علی أسباب الإختلاف ۳۲- ۳۳

Marfat.com

اس نوعیت کے اسباب اختلاف کا اگر تتبع کیا جائے تو مفرد کلمات، تراکیب، اجمال و بیان، عموم و خصوص، اطلاق و تقیید وغیرہ کی بہت ساری مثالیں مل جائیں گی۔ ان مذکورہ باتوں سے اس طرح کی دوسری چیزیں جو سبب اختلاف بنیں اچھی طرح سمجھی جاسکتی ہے۔ اور اس موضوع کی کتابوں سے دیگر معلومات حاصل کی جاسکتی ہے۔[1]

۲۔ روایت

اسبابِ اختلاف کے اس نوع کے متعدد پہلو اور مختلف اثرات و نتائج ہیں۔ علماے سلف کے اکثر فقہی اختلافات اس سے وابستہ ہیں۔ کبھی کسی مجتہد تک حدیث نہیں پہنچ پاتی تو کسی آیت یا دوسری حدیث کا ظاہری مفہوم دیکھ کر یا کسی مسئلہ کا رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا ہو اس پر قیاس کرکے یا استصحاب حال،[2] یا یہ کہ اصل براءت اور عدم تکلیف ہے۔[3] یا اجتہاد کی کسی معتبر وجہ کے مطابق فتویٰ دے دیتا۔

کبھی زیر بحث معاملے میں کسی دوسرے مجتہد کو کوئی حدیث مل جاتی جس کے مطابق وہ فتویٰ دے دیتا تو دونوں مجتہدوں کے فتویٰ میں اختلاف ہو جاتا ہے۔

مجتہد کو کبھی حدیث مل جاتی ہے مگر اس کی نظر میں کوئی ایسی علت ہے جو اس حدیث کے مطابق عمل کرنے سے مانع ہے۔ مثلاً اسے یقین ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے سلسلۂ اسناد میں کوئی راوی مجہول یا متہم یا ضعیف الحافظہ ہے، یا یہ حدیث منقطع یا مرسل ہے یا خبر واحد میں عادل حافظ کی

۱۔ مثلاً: ابن السید البطلیوسی، التنبیه علی الأسباب التي أوجبت الإختلاف بین المسلمین؛ ابن تیمیہ، رفع الملام عن الأئمة الأعلام

۲۔ استصحاب حال: نئے حکم کی عدم موجودگی کی وجہ سے ثابت شدہ حکم کو برقرار رکھنا استصحاب حال کہلاتا ہے۔

۳۔ بنیادی اصول یہ ہے کہ بندے پر کسی قسم کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جب تک کسی دلیل سے وہ ثابت نہ ہو۔

Marfat.com

ایسی شرط عائد کرتا ہے جو دوسرے مجتہد کے یہاں نہیں۔ تو ایک حدیث پر عمل کرتا ہے، کیونکہ اس کے نزدیک اس کا سلسلۂ اسناد صحیح اور متصل ہے اور دوسرا ان مذکورہ علتوں کی وجہ سے اس پر عمل نہیں کرتا۔ اس طرح دونوں کے اقوال متعارض اور مختلف ہو جاتے ہیں۔

حدیث کے معانی و مفاہیم میں اختلاف رائے کی وجہ سے بھی علما کے درمیان اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، جیسے ان مسائل کی تشریح میں ان کے اقوال مختلف ہیں:

مزابنہ[۱]، مخابرہ[۲]، محاقلہ[۳]، ملامسہ[۴]، منابذہ، [۵] غرر[۶]۔

کسی ایک مجتہد کو حدیث کے جو الفاظ ملتے ہیں دوسرے کو اس سے مختلف ملتے ہیں جیسے حدیث کا کوئی لفظ ساقط ہے جس کے بغیر معنیٰ پیدا ہی نہیں ہو سکتا، یا حدیث کا معنیٰ ہی بدل جاتا ہے۔

۱۔ مزابنة: لغت میں مدافعت (ہٹانا یا دور کرنا) کو کہتے ہیں اور اصطلاحی معنیٰ میں لین دین کی ایک خاص قسم مراد ہے، جیسے درخت ہی پر تازہ کھجور کا خشک کھجور سے اور تازہ انگور کا خشک انگور سے تبادلہ۔ یا ناپ کر کھیتی سے گندم کا تبادلہ۔ بعض حضرات مزابنہ سے مزارعہ مراد لیتے ہیں۔ دیکھیے: القاموس الفقهي، ص۱۵۸

۲۔ مخابرة: کھیتی کو بٹائی پر دینا یا کچھ غلہ کے بدلے کھیت میں کام کرنا

۳۔ محاقلة: کھیتی کو پکنے سے پہلے بیچنا

۴۔ ملامسة: عہد جاہلیت کی ایک بیع۔۔۔ جس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ کوئی شخص بیچی جانے والی چیز کو محض چھو دے تو بیع نافذ سمجھی جاتی ہے خواہ وہ اسے الٹ پلٹ کر جانچے یا نہ جانچے۔ اکثر یہ معاملہ کپڑوں ہی میں ہوتا تھا۔

۵۔ منابذة: یہ ہے کہ دوسرے کے کپڑے یا اس کی قیمت سے کوئی شخص اپنے کپڑے کی بیع کرے۔ صرف کپڑے کا پھینکنا ہی وجوبِ بیع کی علامت ہے۔

۶۔ غرر: جس کے وجود و عدم یا قلت و کثرت کا علم نہ ہو، یا جسے سپرد کیے جانے کی طاقت نہ ہو۔

Marfat.com

کبھی کسی مجتہد کے پاس حدیث اپنے متعلقہ واقعہ کے ساتھ پہنچتی ہے جس سے اس کا مفہوم سمجھنے میں اسے آسانی ہوتی ہے اور دوسرے تک وہ حدیث اس طرح نہیں پہنچتی جس سے اس کا اخذ کردہ مفہوم مختلف ہو جاتا ہے۔

ایک راوی کبھی حدیث کا کچھ ٹکڑا اور دوسرا اسے مکمل سنتا ہے۔ کبھی حدیث کسی ایسی کتاب سے نقل کی جاتی ہے جس کا لفظ بدلا ہوا ہو اور اسے ہی وہ نقل کر لیتا ہے اور اسی حدیث کو دوسرا شخص اس کے صحیح الفاظ کے ساتھ کسی دوسری جگہ سے نقل کرتا ہے جس کی وجہ سے رائیں مختلف ہو جاتی ہیں۔ کبھی مجتہد کے نزدیک حدیث صحیح ہوتی ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک دوسری سے زیادہ صحیح اور قوی حدیث سے متعارض ہے، اس لیے زیادہ قوی حدیث کو وہ ترجیح دیتا ہے، یا دونوں دلائل میں زیادہ قوی کون ہے یہ اس پر واضح نہیں ہو پاتا، تو وہ دونوں میں سے کسی سے بھی وہ اس وقت تک استنباط نہیں کرتا جب تک قابلِ ترجیح صورت اس کے سامنے نہ آجائے۔

کوئی مجتہد کبھی ایسی نص پا جاتا ہے جو ناسخِ حدیث ہے یا اس کے عموم کی تخصیص کر دیتی ہے یا مطلق کو مقید بنا دیتی ہے اور دوسرے مجتہد کو ان میں سے کوئی چیز نہیں معلوم ہو پاتی، اس لیے دونوں کا مسلک اس مسئلہ میں الگ الگ ہو جاتا ہے۔[1]

۱۔ رفع الملام، ص ۷

Marfat.com

Marfat.com

فصل پنجم

ائمۂ مجتہدین کے سلیقۂ اختلاف کے چند نقوش

صحابہ و تابعین کی طرح ائمہ فقہ کے درمیان بھی کئی اجتہادی مسائل میں اگرچہ اختلاف ہوا، مگر ان کے اختلافات کے پیچھے ان کی ذاتی خواہشات یا افتراق و انتشار پیدا کرنے کا کوئی دانستہ جذبہ کار فرمانہ تھا، جس کی وجہ سے یہ حضرات راہِ ہدایت سے کبھی بھی ہٹنے نہ پائے۔ ان کی ساری تگ و دو کا مقصد چونکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول اور حق تک رسائی ہوتا تھا، لہٰذا کسی بھی دور کے اہلِ علم کے لیے اجتہادی مسائل میں فتویٰ کی صلاحیت و اہلیت کے حامل مفتی حضرات کے فتاویٰ سے صرفِ نظر ممکن نہ تھا، البتہ ان کے خیال میں اگر فتویٰ درست ہوتا تو اسے درست قرار دیتے اور اس میں کسی خامی کی صورت میں ان کے لیے استغفار کرتے اور ان کے بارے میں حسنِ ظن سے کام لیتے تھے۔ اسی طرح قاضیوں کا تعلق خواہ کسی بھی مکتبہ فکر اور مسلک سے ہوتا، ان کے فیصلوں کو تسلیم کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ضرورت پیش آنے پر خود قاضی اپنے خاص مسلک کے خلاف بھی فیصلے کرتے تھے اور ایسا کرنے میں کوئی حرج یا تنگی محسوس نہ کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان تمام حضرات کی آرا اور دلائل اگرچہ مختلف ہوتے، مگر وہ جس سرچشمہ سے سیراب ہوتے تھے، اس کا منبع ایک ہی تھا۔

ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ رائے یا اجتہاد کا اظہار اس طرح کے الفاظ میں کرتے، جیسے: هذا أحوط (میرے خیال میں یہ زیادہ محتاط رائے ہے) یا هذا أحسن (میرے خیال میں یہ زیادہ بہتر ہے) یا هذا ما ينبغي (یہ مناسب معلوم ہوتا ہے) یا لا

Marfat.com

یعجبني یا نکرہ ھذا (ہمیں یہ بات پسند نہیں) وغیرہ۔ اس طرح نہ تو کسی پر کوئی تنگی اور نکیر ہوتی اور نہ ہی الزام و اتہام تراشی۔ اسی طرح ایسی کسی رائے کے اظہار پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی، جس کے لیے کوئی نہ کوئی دلیل موجود ہو؛ بلکہ لوگوں کے معاملات میں آسانی پیدا کرنے کے لیے پوری وسعت ظرفی اور کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔

اختلافی مسائل کی چند مثالیں

صحابہ و تابعین اور بعد کے فقہا میں سے کچھ حضرات بسم اللہ پڑھ کر نماز شروع کرنے کے قائل تھے، جبکہ بعض دیگر حضرات ایسا کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کچھ اسے بلند آواز میں پڑھتے تھے اور کچھ آہستہ۔ فجر میں کچھ لوگ دعاے قنوت پڑھتے تھے، کچھ نہیں پڑھتے تھے۔ بعض کی رائے تھی کہ نکسیر پھوٹنے، قے آنے اور سینگی لگوانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے جبکہ دیگر حضرات اس رائے کے قائل نہ تھے۔ بعض کی رائے کے مطابق عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوت جاتا ہے اور بعض کے ہاں نہیں ٹوٹتا۔ اونٹ کا گوشت یا کوئی ایسی چیز جسے براہِ راست آگ نے چھوا ہو، اس کے کھانے سے کسی کے ہاں وضو کرنا ضروری تھا اور کسی کے ہاں نہیں تھا۔

اس کے باوجود تمام حضرات ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔ جیسے مدینہ منورہ کے مالکی اور دیگر ائمہ باوجودیکہ بسم اللہ نہ تو جہراً پڑھتے تھے اور نہ ہی سراً، مگر امام ابو حنیفہؒ خود اور ان کے ساتھی نیز امام شافعیؒ اور دیگر ائمہ، ان کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ایک دن سینگی

Marfat.com

لگوانے کے بعد امامت کی، اور امام ابو یوسفؒ نے بھی ان کی اقتدا میں نماز ادا کی اور بعد میں نماز کو لوٹایا نہیں، حالانکہ ان کے مذہب میں پچھنے لگوانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک تھا کہ نکسیر پھوٹنے اور سینگی لگوانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ اگر وضو کرنے کے بعد امام کے بدن سے خون نکلے اور وہ دوبارہ وضو نہ کرے تو کیا ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھی جاسکتی ہے؟ آپ نے جواب دیا: امام مالکؒ اور سعید بن المسیبؒ (جیسے ائمہ) کے پیچھے میں نماز پڑھنے سے کیسے گریز کر سکتا ہوں؟ (ان دونوں حضرات کے ہاں خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا)۔

امام شافعیؒ صبح کی نماز میں دعاے قنوت پڑھنے کے قائل تھے۔ ایک مرتبہ بغداد میں امام ابو حنیفہؒ کی قبر کے قریب والی مسجد میں ان کو صبح کی نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا، تو انہوں نے دعاے قنوت نہیں پڑھی۔ جب ان سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: کیا ان کے روبرو میں ان کے مسلک کی خلاف ورزی کی جرأت کر سکتا ہوں؟ پھر کہا: کبھی کبھی ہم اہل عراق کے مذہب پر بھی عمل کر لیتے ہیں۔[1]

فقہا میں امام مالکؒ اہل مدینہ کی روایت کردہ احادیث کے سلسلے میں ثقہ اور مستند سمجھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور ان کے شاگرد مدینہ کے معروف فقہاے سبعہ[2] کے اقوال کے بھی سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ آپ اور آپ جیسے دیگر فقہا کے ذریعے ہی علم روایت

۱۔ حجة الله البالغة، ص۲۳۵

۲۔ فقہاے سبعہ سے مدینہ کے اس دور کے سات نام ور اہل علم مراد ہیں: سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، خارجہ بن زید، ابو بکر بن عبد الرحمن بن حارث بن ہشام، سلیمان بن یسار اور عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود

Marfat.com

وفتویٰ کی بنیاد پڑی۔ آپ نے حدیث وفتویٰ میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور کتاب الموطأ تالیف کی جس میں اہلِ حجاز کی قوی روایات، صحابہؓ کے ثابت شدہ اقوال اور تابعین کے مستند فتاویٰ جمع کر دیے۔ آپ نے اپنی کتاب کو فقہی ابواب کے مطابق بڑی عمدہ ترتیب دی ہے جو آپ کی چالیس سالہ عرق ریزی کا ثمرہ ہے۔ تاریخ اسلام میں حدیث وفقہ کی یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ امام کے ستر معاصر علماے حجاز نے اس کی تائید وتوثیق کی۔ اس کے باوجود خلیفہ منصور نے جب اس کے چند نسخے تیار کروا کر دوسرے شہروں میں بھیجنے کا خیال ظاہر کیا تاکہ تمام لوگ صرف اس کے مطابق عمل کریں، اور اختلافات کا خاتمہ ہو، تو سب سے پہلے امام مالکؒ نے ہی اس تجویز کو رد کیا اور کہا: امیر المؤمنین، آپ ایسا نہ کریں، اس لیے کہ لوگوں تک اس سے پہلے بہت سے اقوال اور احادیث وروایات پہنچ چکی ہیں، ہر ایک نے اپنے تک پہنچنے والی روایت کو اپنا لیا ہے، جس سے ان کے درمیان خود ہی اختلاف رونما ہو چکا ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنے لیے جو چیز اختیار کر لی ہے اسی پر آپ انہیں چھوڑ دیں۔ خلیفہ منصور ان کا جواب سن کر مطمئن ہو گیا اور کہا: ابو عبد اللہ! اللہ آپ کو مزید توفیق بخشے۔[1]

یہ کیسے جلیل القدر امام تھے جنہیں یہ بات ناگوار تھی کہ لوگوں کو صرف ان کی تالیف کردہ کتاب پر عمل کا پابند بنایا جائے۔ حالانکہ اس کتاب میں انہوں نے احادیث واقوال کا وہ بہترین ذخیرہ جمع کر دیا تھا جو ان کے نزدیک مستند ترین اور پوری طرح قابلِ اعتماد تھا، اور جس کے بارے میں اہلِ مدینہ اور معاصر علما کی اتنی بڑی جماعت کو کوئی اختلاف بھی نہ تھا۔

۱۔ حجة الله البالغة، ص۳۰۷؛ الفكر السامي ۱: ۳۳۶

Marfat.com

امام مالک کے نام لیث بن سعد کا مکتوب

غالباً ادبِ اختلاف کی سب سے عمدہ اور بہترین مثال وہ مکتوب ہے جو مصر کے فقیہ و عالم امام لیث بن سعد نے امام مالکؒ کے نام بھیجا۔ کمالِ ادب کے ساتھ اس میں آپ نے ان سب مسائل کا ذکر کیا ہے جس میں ان دونوں حضرات کا اختلاف تھا۔ یہ مکتوب کافی طویل ہے اس لیے اس کا صرف ایک انتخاب ہی یہاں پیش کیا جاتا ہے، جس سے یہ واضح ہو جائے کہ اس امت کے اسلاف اور علما، فقہا نے کن آدابِ اختلاف کے سائے میں پرورش پائی تھی۔ امام لیث بن سعد کہتے ہیں:

آپ پر سلامتی ہو۔ اس اللہ کی حمد و ثنا جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ حمد و صلاۃ کے بعد دعا ہے کہ اللہ ہمیں اور آپ کو اپنی عافیت میں رکھے اور دنیا و آخرت میں انجام بخیر فرمائے۔ آپ کا مکتوب ملا جس میں آپ نے خیر خیریت کا ذکر کیا ہے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ اسی طرح رکھے اور اپنے فضل و احسان سے مزید حمایت و نصرت عطا فرمائے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

میرے کچھ ایسے فتاویٰ کا آپ کو علم ہوا ہے جس کے خلاف آپ کے یہاں لوگوں کا عمل ہے اور یہ کہ فتاوی میں اپنے اوپر اعتماد کرنے سے مجھے ڈرنا چاہیے، تمام لوگ اہل مدینہ کے تابع ہیں جہاں آنحضرت ﷺ کی ہجرت ہوئی اور جہاں نزولِ قرآن ہوا۔ آپ نے جو کچھ لکھا درست اور بجا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ مجھ پر آپ کی تحریر کا وہی اثر ہوا جو آپ چاہتے ہیں۔ میں شاذ فتاویٰ کی ناپسندیدگی، سابقین علماے مدینہ کی افضلیت تسلیم کرنے اور ان کے متفقہ فتاویٰ

Marfat.com

قبول کرنے میں کسی عالم کو اپنے سے زیادہ نہیں پاتا جس پر اللہ رب العالمین کا شکر ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

پھر امام لیث بن سعد اپنے اور امام مالک کے درمیان عمل اہل مدینہ کی حجیت سے اپنے اختلاف کی وجوہ بیان کرتے اور اس کی وضاحت کرتے ہیں:

بہت سے اسلاف کرام جنہوں نے درس گاہ نبوت میں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی تعلیم پائی وہ جہاد کرتے ہوئے زمین کے شرق وغرب میں پھیل گئے، تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں میں بھی بہت سی چیزوں میں بھی اختلاف ہے۔ جیسے ربیعہ بن ابو عبد الرحمن (ان پر بعض اعتراضات کا ذکر کرنے کے بعد لکھا) بحمد للہ اس کے باوجود ربیعہ کے یہاں بڑی خیر، جزرس عقل، فصیح وبلیغ زبان، نمایاں فضیلت، اسلامی سیرت وکردار کا بہترین نمونہ اور اپنے بھائیوں کے لیے عام طور پر اور ہمارے لیے خاص طور پر اخلاص اور سچی محبت ہے۔ اللہ انہیں رحمت ومغفرت سے نوازے اور ان کے اعمال کی جزائے خیر دے۔

اس کے بعد اپنے اور امام مالک کے درمیان اختلافی مسائل کی کئی مثالیں دیں، جیسے:

الجمع ليلة المطر- القضاء بشاهد ويمين- مؤخر الصداق لا يقبض إلا عند الفراق. تقديم الصلاة على الخطبة في الاستسقاء... وغيره۔

آخر میں لکھتے ہیں:

اس طرح کی بہت سی دوسری چیزوں کا میں نے ذکر نہیں کیا۔ اللہ آپ کو خیر و صلاح عطا فرمائے۔ لمبی عمر عطا فرمائے، کیوں کہ اسی میں لوگوں کی بھلائی ہے اور آپ کے چلے جانے سے مسلمانوں کا بڑا نقصان ہے۔ جگہ کی دوری کے باوجود

Marfat.com

آپ کے مقام و مرتبہ سے آشنا ہوں۔ یقین کریں آپ کے بارے میں میری یہی رائے اور یہی قدر و منزلت ہے۔ اپنے اور اہل و عیال کے حالات سے اور اگر آپ یا آپ کے متعلقین کو کوئی ضرورت ہو تو اس سے بھی مجھے باخبر فرماتے رہیں۔ مجھے مسرت ہوگی۔ الحمدللہ ہم بخیر و عافیت ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ اس نے ہم سب کو جو نعمتیں دے رکھی ہیں، وہ مکمل فرمادے اور ان کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ[1]

عمیق علمی مباحث پر مشتمل ادبِ اختلاف کے نمونوں سے سیر و سوانح اور تاریخ و مناظرہ کی کتابیں بھری ہیں، لیکن رواجِ تقلید، پھر اہل علم کا باہمی تعصب و تنگ نظری اور اس کے بعد معیارِ تعلیم اور مقصودِ علم کی تبدیلی نے ادبِ اختلاف کی شان دار روایت تقریباً ختم ہی کر دی۔ خاص طور پر ایسے مخلص علما کے وجودِ مسعود سے میدان خالی ہونے لگے جن کے بارے میں امام غزالی کہتے ہیں:

تابعی علما جو باقی رہ گئے تھے وہ پہلی طرز اور طریقے پر قائم رہ کر دین کی طہارت و پاکیزگی کے ساتھ علماے سلف کی راہ پر گامزن تھے۔ لوگ انہیں (عہدہ و منصب وغیرہ کے لیے) ڈھونڈتے تو وہ ساری چیزوں سے کنارہ کش ہو کر ان سے راہِ فرار اختیار کرتے۔

۱۔ پورے مکتوب کے لیے ملاحظہ ہو: إعلام الموقعين ۳: ۸۳- ۸۸؛ الفكر السامي ۱: ۳۷۰- ۳۷۶

Marfat.com

خلفا انہیں عہدہ قضا و امارات کے لیے ڈھونڈتے تھے۔ لیکن اس مبارک جماعت کی جگہ دین کے ذریعہ دنیا کے طلب گار آگئے اور اچھوں کی جگہ بروں نے لے لی۔ اس سلسلے میں بھی امام غزالی کہتے ہیں:

اس زمانہ کے لوگوں نے دیکھا کہ کس طرح خلفا و امرا علمائے دین کی عزت و تکریم کر رہے ہیں اور ان کے بے غرضی اور بے توجہی کے باوجود ان کی نگاہِ التفات کے کتنے منتظر ہیں تو وہ ان والیوں اور حکمرانوں کی طرف سے یہی عزت اور جاہ و حشمت پانے کی خاطر طلبِ علم پر ٹوٹ پڑے۔ افتا سیکھ کر ان کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرکے ان سے صلے اور مناصبِ حکومت کے طالب بنے۔ جن میں سے کچھ کامیاب بھی ہوئے، لیکن حکمرانوں کے سامنے سرنگوں ہونے اور طلب کی ذلت سے وہ نہ بچ سکے۔ پہلے یہی فقہا مطلوب تھے اور اب طالب بن گئے۔ سلاطین سے دور رہ کر باعزت تھے اور اب خود ان کا تقرب حاصل کرکے ذلت کا شکار ہونے لگے۔ سوائے ان علمائے حق کے جنہیں اللہ تعالیٰ ہر دور میں توفیق سے نوازتا ہے۔[1]

امام غزالی نے علما کی اس وقت کی تصویر کشی کی ہے جب دنیا طلبی ان کا مقصد اور دین حکمرانوں کے آستانوں کا زینہ بن گیا، اور حکمرانوں کی نظر التفات حاصل کرنے کے لیے علما کا لبادہ اوڑھ کر لوگوں نے علم کی طلب و تحصیل شروع کر دی۔

امام مالکؒ کہتے ہیں: علم دین ایسا علم ہے، جسے چار قسم کے لوگوں سے حاصل نہیں کیا جاسکتا: بیوقوف و احمق سے، نفس پرست سے جو گمراہی پھیلانے پر کمربستہ ہو،

۱۔ إحياء علوم الدين ۱: ۴۱ ومابعد، الباب الرابع في سبب إقبال الخلق على علم الخلاف

Marfat.com

جھوٹے اور کذّاب سے جو لوگوں کے ساتھ معاملات میں دروغ گوئی سے کام لیتا ہو، خواہ وہ روایتِ حدیث کے سلسلے میں ہی کیوں نہ ہو، اور ایسے شخص سے جو عابد و زاہد اور متقی تو ہو، مگر اسے اس چیز کی صحت و ضعف کا علم نہ ہو جسے وہ بیان کر رہا ہے۔[1]

نیز آپ نے کہا:

یہ علم دراصل دین ہی ہے، اس لیے جس شخص سے اسے حاصل کر رہے ہو، اس کے بارے میں غور و فکر سے کام لینا چاہیے۔ میں نے ستر علما کو دیکھا جو مسجدِ نبویؐ کے ان ستونوں کے پاس بیٹھ کر قال رسول اللہ ﷺ کہہ رہے تھے، مگر ان میں سے کسی سے بھی میں نے کوئی روایت نہیں لی۔ ان میں سے کسی کو بھی اگر بیت المال کا نگران بنا دیا جاتا، تو بلاشبہہ وہ اس میں ذرہ برابر خیانت کا مرتکب نہ ہوتا، مگر اس عظیم الشان کام (روایتِ حدیث) کے وہ بہر حال اہل نہیں تھے۔ دوسری طرف ابن شہاب (امام زُہری) جب ہمارے ہاں تشریف لائے تو ان کے دروازے پر ہر وقت علم کے متلاشی لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔[2]

فقہا کے آدابِ اختلاف کے چند نقوش

حقیقت یہ ہے کہ ان صفات کے حامل افراد کے درمیان کوئی بڑا اختلاف رونما ہونا بعید از امکان تھا، اور اگر تھوڑا بہت اختلاف واقع ہوا بھی تو وہ صرف حق کے لیے ہوا کرتا تھا۔ ان کے دلوں میں ہویٰ و ہوس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ جن آدابِ اختلاف پر ہمارے علماے سلف کاربند رہے ان کے چند نمونے ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ اپنے لیے ہم انہیں مشعلِ راہ بنا سکیں۔

۱۔ الانتقاء، ص۱۶

۲۔ ایضاً، ص۱۶

Marfat.com

امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ

امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے فقہی مسالک میں جو فرق ہے اور جو ہم بیان بھی کر آئے ہیں، وہ اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ اسی طرح دونوں حضرات کے ہاں مروج اصول و ضوابطِ اجتہاد کی بنیادیں بھی الگ الگ ہیں اور دونوں میں عمر کا بھی تفاوت تھا۔ اس کے باوجود ایک دوسرے کے احترام میں کوئی چیز مانع نہ ہو سکی اور فقہ میں طریق کار کا اختلاف ان کے دلوں میں باہمی محبت اور احترام میں کمی کا سبب نہیں بننے پایا۔

قاضی عیاض اپنی کتاب المدارك میں لیثؒ بن سعد کی زبانی لکھتے ہیں: ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں امام مالکؒ سے ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے آپ سے کہا: کیا وجہ ہے کہ میں آپ کو اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے جواب دیا: ابو حنیفہؒ سے گفتگو نے مجھے پسینہ پسینہ کر دیا۔ اے مصری! وہ بلاشبہہ فقیہ ہیں۔

امام لیثؒ نے کہا: اس کے بعد میں نے امام ابو حنیفہؒ سے ملاقات کی اور کہا: اس شخص نے (اشارہ امام مالک کی طرف تھا) آپ کے بارے میں کتنی اچھی بات کہی ہے۔ تو آپ نے کہا: صحیح جواب دینے اور بھرپور نقد کرنے میں ان سے تیز ذہن آدمی میں نے نہیں دیکھا۔[1]

امام محمد اور امام مالک

امام محمد بن الحسن، امام ابو حنیفہ کے تلامذہ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہی آپ کے مذہب کی تدوین (اور نشر و اشاعت) کی۔ امام محمد، امام مالک کی طرف بھی سفر کر کے گئے، اور تین سال تک ان کے ہاں رہے، اور ان سے موطأ اخذ کی۔

۱۔ ایضاً، ص ۱۶

Marfat.com

ایک روز امام محمد اور امام شافعی آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ امام محمد نے کہا: ہمارے شیخ (یعنی امام ابو حنیفہ) آپ کے شیخ (امام مالک) سے بڑے عالم ہیں۔ ہمارے شیخ کو چپ نہیں رہنا چاہیے اور آپ کے شیخ کو بولنا نہیں چاہیے! گویا امام محمد، امام شافعی کو چھیڑ رہے تھے، اس پر امام شافعی بولے:

میں آپ کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ سنت رسول اللہ ﷺ کا زیادہ علم رکھنے والا کون ہے، مالک یا ابو حنیفہ؟ امام محمد نے کہا: مالک، مگر ابو حنیفہ قیاس و استنباط میں ان سے آگے ہیں۔ امام شافعی نے کہا: میں نے کہا: ہاں صحیح ہے، مگر مالک کتاب اللہ کے ابو حنیفہ سے زیادہ جاننے والے ہیں؛ اس لیے جو کتاب و سنت زیادہ جانتا ہو، اسے گفتگو کرنے کا زیادہ حق ہے۔

امام محمد یہ سن کر خاموش ہو گئے۔[1]

امام شافعیؒ اور امام محمدؒ

امام شافعیؒ کہتے ہیں: ایک روز میرا اور محمد بن الحسن کا مباحثہ ہوا، بات بڑھتے بڑھتے تنازع کی حد تک پہنچ گئی؛ حتیٰ کہ یوں محسوس ہونے لگا گویا ان کی رگیں پھٹ پڑیں گی اور بٹن ٹوٹ جائیں گے۔[2]

امام محمدؒ کہتے ہیں: اگر کبھی اختلافی مسائل میں ہم پر کوئی شخص حاوی ہو، تو وہ شافعیؒ کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا: ان

۱۔ ایضاً، ص۱۶

۲۔ ایضاً، ص۱۶

Marfat.com

کے زورِ بیان اور غور سے بات سن کر پورے اعتماد و یقین کے ساتھ سوال و جواب کرنے کی خوبی کی بنا پر۔[1]

علمائے امت کے آدابِ اختلاف کے ان نمونوں سے یہ نتائج سامنے آتے ہیں کہ قرونِ خیر میں بعد میں آنے والے حضرات نے اسلام کے نقشِ قدم پر چلنے اور ادب نبوی ﷺ سے فیض یاب ہوتے رہنے کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ سلف صالحین آدابِ اختلاف میں صرف طنز و تعریض سے ہی اجتناب نہیں کرتے تھے، بلکہ اس دور میں حصولِ علم پر اپنی توجہ مرکوز رکھنے اور غیر ضروری باتوں سے اجتناب کرنا ان کا شیوہ بن چکا تھا۔ نیز وہ نادانستہ غلطی کے ارتکاب کے ڈر سے پر فتویٰ دینے سے احتراز کرتے تھے۔

قوت القلوب کے مؤلف عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں، جس میں انہوں نے بیان کیا: اس مسجد میں (اشارہ مسجد نبوی کی طرف ہے) میں نے ایک سو بیس صحابہؓ کو اس حال میں دیکھا کہ ان میں سے کسی سے اگر کوئی حدیث یا فتویٰ پوچھا جاتا تو اس کی یہی خواہش ہوتی کہ کوئی دوسرا بھائی ہی اس کے متعلق بتائے۔ بالفاظِ دیگر کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ دوسرے کے پاس بھیج دیتا اور وہ کسی اور کے پاس، اس طرح سائل گھومتے ہوئے پھر اس شخص کے ہاں واپس پہنچتا، جس سے پہلی مرتبہ اس نے سوال پوچھا تھا۔[2]

اس سلسلے میں وہ سبکی یا شرمندگی کے جذبات و احساس سے بالاتر ہو چکے تھے۔ یہ غلطی کا خدشہ ہی تھا، جو انہیں بعض اوقات کسی مسئلے کے جواب میں توقف پر مجبور کر دیتا تھا۔

۱۔ ایضاً، ص۳۸

۲۔ إتحاف السادة المتقين ۱: ۲۷۹- ۲۸۰

Marfat.com

اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص امام مالکؒ سے کوئی مسئلہ پوچھنے کے لیے حاضر ہوا اور عرض کی کہ اس کی قوم نے اسے یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے ایسی جگہ سے بھیجا ہے جس کا فاصلہ یہاں سے چھ ماہ کا ہے۔ آپ نے کہا: جس نے تمہیں بھیجا ہے اس سے جاکر کہہ دو کہ میں یہ مسئلہ نہیں جانتا۔ اس شخص نے کہا: پھر اسے کون جانتا ہے؟ آپ نے کہا: وہی جسے اللہ نے اس کا علم دیا ہے۔ ملائکہ نے کہا تھا: ﴿لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ [البقرۃ۲: ۳۲] (ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا تو نے ہمیں سکھایا ہے)۔

امام مالکؒ ہی کے متعلق یہ بھی روایت ہے کہ ان سے اڑتالیس مسائل پوچھے گئے، جن میں سے بتیس کے بارے میں آپ نے کہا: لا أدري (میں نہیں جانتا)۔

خالد بن خداش کہتے ہیں: میں عراق سے چالیس مسئلے معلوم کرنے کے لیے امام مالکؒ کے ہاں حاضر ہوا، جن میں سے آپ نے صرف پانچ کے جواب دیے۔

ابن عجلان کہتے ہیں: اگر عالم لا أدري کہنا چھوڑ دے تو ہلاکت و بربادی اس کا مقدر ہو گا۔

امام مالکؒ، عبداللہ بن یزید بن ہُرمز سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: عالم کو چاہیے کہ اپنے ہم نشینوں کو لا أدري کہنا سکھائے، تاکہ ان سے جب کسی ایسے مسئلے کے بارے میں سوال کیا جائے جس کا جواب انہیں معلوم نہ ہو تو وہ لا أدري کہہ کر اپنی جان بچا سکیں۔ حافظ ابن عبدالبرؒ (م۴۶۳ھ) کہتے ہیں: حضرت ابوالدرداءؓ سے یہ صحیح روایت ہے کہ انہوں نے کہا: لا أدري کہنا آدھا علم ہے۔

Marfat.com

امام مالکؒ اور امام ابن عُیینہؒ

امام ابن عُیینہ[1] امام مالک کے ہم عصر اور ہم سر تھے۔ امام شافعی کہتے ہیں: مالک اور ابن عیینہ دونوں معاصر ہیں۔ اگر یہ دونوں نہ ہوتے تو حجاز سے علم رخصت ہو جاتا۔[2]

اس کے باوجود روایت ہے کہ ابن عیینہ نے ایک بار ایک حدیث ذکر کی تو ان سے کہا گیا کہ اس حدیث میں امام مالک آپ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا: مالک سے مجھے ملا رہے ہو؟ کہاں وہ اور کہاں میں؟ دونوں کا کیا مقابلہ!

سفیان بن عیینہ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے کہ:

"قریب ہے کہ لوگ طلب علم میں سفر کریں گے تو عالم مدینہ سے بڑا کوئی عالم نہ پائیں گے۔" سفیان سے پوچھا گیا: وہ کون عالم ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: "وہ مالک بن انس ہیں۔" نیز کہتے تھے: امام مالک صحیح احادیث ہی روایت اور بلاغ کرتے تھے۔ ثقہ راویوں سے وہ حدیثیں لیتے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ مدینہ میں ان کے بعد علمی لحاظ سے ویرانی چھا جائے گی۔"[3]

۱۔ ابو محمد سفیان بن ابی عیینہ بن ابی عمران میمون ہلالی، محدث، فقیہ اور کوفہ کے امام۔ کوفہ میں ولادت اور مکہ مکرمہ میں ۱۹۸ھ میں وفات ہوئی۔ ان کتابوں میں آپ کے حالاتِ زندگی درج ہیں: تاریخ بغداد ۹: ۱۷۴؛ الحلیة ۷: ۲۷۰؛ طبقات ابن سعد ۵: ۴۹۷؛ الجرح والتعدیل ۲/ق۱/ ۵۵؛ تہذیب التہذیب ۴: ۱۱۷

۲۔ الانتقاء، ص۲۲

۳۔ ایضاً، ص۳۶

Marfat.com

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ

امام شافعیؒ کہتے ہیں: مالک بن انس میرے استاد ہیں، انہی سے میں نے علم حاصل کیا ہے، علما کے حلقے میں وہ روشن ستارے کی مانند ہیں۔ میرے نزدیک ان سے بڑھ کر قابلِ اعتماد اور بھروسے کے لائق کوئی نہیں۔

نیز کہا کرتے تھے: اگر مالکؒ کے واسطہ سے کوئی حدیث تم تک پہنچے تو اسے مضبوطی سے تھام لو، اس لیے کہ انہیں جب کسی حدیث کی صحت کے بارے میں ذرا سا بھی شبہہ ہوتا، تو اسے مکمل طور پر چھوڑ دیتے۔[1]

امام احمد بن حنبلؒ اور امام مالکؒ

ابو زُرعہ دمشقی سے روایت ہے: ایک مرتبہ امام احمدؒ سے پوچھا گیا کہ اگر سفیان ثوریؒ اور امام مالکؒ کا کسی روایت کے بارے میں اختلاف ہو جائے تو آپ کے نزدیک کون قابلِ ترجیح ہے؟ امام احمدؒ نے کہا: میرے دل میں امام مالکؒ کی زیادہ عظمت ہے۔ پھر میں نے پوچھا: مالکؒ اور اوزاعیؒ اگر آپس میں اختلاف کریں؟ آپ نے جواب دیا: مالکؒ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہیں، اگرچہ اوزاعیؒ بھی اپنی جگہ امام ہیں۔ پھر پوچھا گیا: ابراہیم نخعیؒ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ (یہ سوال شاید اس حقیقت کو مدِ نظر رکھ کر کیا گیا کہ ابراہیم نخعیؒ اور امام مالکؒ نہ تو ہم عصر تھے اور نہ ہی ان دونوں کا علمی میدان مشترک تھا اور سائل کے خیال میں نخعی کو اہل الحدیث میں سے نہ ہونے کی بنا پر مالک کا ہم پلا نہ ٹھہرایا جانا چاہیے) امام احمدؒ نے کہا: ان کو ان کے اپنے معاصرین کے ساتھ رکھو۔" پھر ان سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص صرف کسی ایک

۱۔ ایضاً، ص ۲۳

Marfat.com

محدث کی روایات حفظ کرنا چاہے تو آپ کی نظر میں ایسا محدث کون ہو سکتا ہے؟ انہوں نے کہا: میں امام مالکؒ کی روایات حفظ کرنے کا مشورہ دوں گا۔[1]

امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں اہلِ علم کی توصیفی آرا

شعبہؒ بن الحجاج (م ۱۶۰ھ) علم حدیث میں امیر المؤمنین کا درجہ رکھتے تھے اور اہلِ رائے میں امام ابو حنیفہؒ کا جو مرتبہ و مقام ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ دونوں کے نقطۂ نظر میں اس واضح فرق کے باوجود شعبہؒ امام ابو حنیفہؒ کے علم و فضل کے بڑے قدردان تھے۔ دونوں حضرات کے درمیان باہمی محبت تھی اور خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ وہ امام ابو حنیفہؒ کو ثقہ قرار دیتے تھے، اور ان سے حدیث بیان کرنے کو کہا کرتے تھے۔ انہیں جب امام ابو حنیفہؒ کے انتقال کی خبر پہنچی تو کہا: ان کے ساتھ ہی کوفہ کی فقہ بھی رخصت ہو گئی، انہیں اور ہمیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے نوازے۔[2]

مشہور محدث و نقاد یحییٰ بن سعید القطان سے کسی نے امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں ان کی رائے پوچھی تو انہوں نے سائل کی رو رعایت کیے بغیر جواب دیا: بخدا، ان کی جو اچھی بات ہوتی ہے، اس کو قبول کرنے میں ہمیں کوئی تامل نہیں ہوتا۔[3]

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ائمۂ کرام اختلاف رائے کے باوجود ایک دوسرے کی اچھی باتیں قبول کر لیتے تھے، ان کی فضیلت کا برملا اعتراف کر دیتے، اور ان کے اقوال انہی کی طرف منسوب کرتے تھے۔

۱۔ ایضاً، ص ۳۰
۲۔ ایضاً، ص ۱۹۶
۳۔ ایضاً، ص ۲۰۳

Marfat.com

مشہور بزرگ، عابد وزاہد اور مجاہد حضرت عبداللہ بن المبارکؒ سے امام ابو حنیفہؒ کی تعریف وتوصیف میں کئی روایات نقل ہوئی ہیں۔ وہ امام صاحب کا تذکرہ بہت اچھے انداز میں کرتے اور ان کی راست روی کے چرچے کرتے، ان کی مدح میں رطب اللسان رہتے اور ان کے اقوال کو قبول کرتے تھے۔ اپنی مسجد میں ان کے خلاف کوئی ناروا بات کہنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شریکِ مجلس نے امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں اشارۃً نامناسب بات کرنا چاہی، توانہوں نے اسے فوراً ٹوک دیا اور کہا: خاموش رہو، اگر تمہیں ابو حنیفہؒ کی زیارت نصیب ہوتی تو تمہیں (ان کی ذات میں) علم و فضل ہی نظر آتا۔[1]

امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: امام مالکؒ سے ایک مرتبہ عثمان بتی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: وہ اوسط درجے کی صلاحیت کے مالک ہیں۔ پھر ابن شُبرمہؒ کے بارے میں پوچھا گیا تو بھی انہوں نے یہی جواب دیا۔ اس کے بعد امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا: اگر وہ مسجد کے (مٹی اور کنکر سے بنے ہوئے) ان ستونوں کو لکڑی کے ستونوں پر قیاس کرتے ہوئے اپنا استدلال پیش کریں تو بھی ان کے استدلال میں اس قدر قوت ہوگی کہ تمہیں ان کے استدلال کو تسلیم کرنا پڑے گا۔[2] امام شافعیؒ سے مروی یہ مقولہ تو بہت مشہور ہے کہ فقہ میں لوگ ابو حنیفہؒ کے محتاج ہیں۔[3]

۱۔ ایضاً، ص۲۰۶-۲۰۷

۲۔ ایضاً، ص۲۶۹

۳۔ ایضاً، ص۲۱۰

Marfat.com

ان حضرات کی مجلسوں میں سب کا ذکر اچھائی ہی سے ہوا کرتا تھا۔ اگر کوئی شخص ائمہ کے بارے میں حدودِ ادب سے تجاوز کرنے کی کوشش کرتا تو اسے راہِ راست پر لگا دیا جاتا تھا۔ اسی طرح کسی امام کے بارے میں ناپسندیدہ بات کرنے والے کو فوراً ٹوک دیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ایک بزرگ فضل بن موسیٰ السِینانیؒ سے پوچھا گیا کہ امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں ناشائستہ باتیں کرنے والوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ابو حنیفہؒ نے وہ تمام علم پیش کر دیا جس سے یہ لوگ واقف تھے یا جس سے یہ ناواقف و ناآشنا تھے اور ان کے لیے کچھ رہنے نہیں دیا، اس وجہ سے لوگ ان سے حسد کرنے لگے۔[1]

یہ اقوال ان ائمۂ حدیث کے ہیں جو امام صاحب کی بہت سی آرا سے اختلاف رکھتے تھے۔ اس اختلاف کے باوجود انہوں نے امام صاحب کی تعریف و توصیف کی اور ان کی خوبیوں کا برملا اعتراف کیا۔ کیونکہ ان کے باہمی اختلاف کے پیچھے نہ تو نفسانی خواہشات تھیں اور نہ ہی تفوّق و برتری کی آرزو، بلکہ تمام حضرات تلاشِ حق ہی کو اپنی متاعِ گم گشتہ سمجھتے تھے۔ یہ آدابِ حسنہ اگر ان کے اندر نہ پائے گئے ہوتے تو بہت سے علمائے سلف کا فقہی ورثہ ناپید ہو چکا ہوتا۔ ایک دوسرے کا دفاع بھی وہ اسی لیے کرتے تھے کہ امت کے اس گراں قدر اثاثے کی، جس کے ذریعے ہی سے اس امت کا نظامِ زندگی راہ راست پر قائم رہ سکتا ہے، حفاظت کا اہتمام ہو سکے۔

۱۔ ایضاً، ص ۲۱۱

Marfat.com

امام شافعیؒ کے بارے میں اہل علم کی توصیفی آرا

سفیان بن عُیینہؒ جیسے بلند مرتبہ ومقام کے حامل عالم وفقیہ کے سامنے جب تفسیر اور فتویٰ کا کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو امام شافعیؒ کی طرف رُخ کرکے کہتے: ان سے پوچھو۔ وہ آپ کے بارے میں اکثر کہا کرتے: یہ اپنے وقت کا سب سے بہتر نوجوان ہے۔ آپ کی وفات کی خبر سن کر فرمایا: محمدؒ بن ادریس (شافعی) کے انتقال سے زمانے کا سب سے بہتر شخص اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔[1]

یحییٰ بن سعید القطان کہا کرتے تھے: "میں اپنی نماز میں بھی شافعیؒ کے لیے دعا کرتا ہوں۔"[2]

ایک دوسرے عالم عبداللہ بن عبدالحکم اور ان کا صاحب زادہ مسلک کے لحاظ سے امام مالکؒ کے پیروکار تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے بیٹے کو امام شافعیؒ کی صحبت اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا: ان (شافعیؒ) کا دامن تھامے رہنا۔ علم اصول (اصول فقہ) کا ان سے بڑھ کر عالم میں نے کوئی نہیں پایا۔" ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے اپنے باپ کی اس نصیحت پر خوب عمل کیا اور اس کا انہیں بہت فائدہ بھی ہوا، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں: "اگر امام شافعیؒ نہ ہوتے تو مجھے کسی کی بات کا جواب دینا تک نہ آتا، یہ سب کچھ میں نے انہی سے سیکھا۔ انہوں نے ہی مجھے "قیاس" سکھایا۔ اللہ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے! بلاشبہہ وہ سنت و آثار میں کامل مہارت رکھتے

۱۔ ایضاً، ص ۱۲۰-۱۲۱

۲۔ ایضاً، ص ۱۲۲

Marfat.com

تھے۔ اپنی ذات میں فضیلت و خیر سموئے ہوئے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ فصیح و بلیغ زبان اور محکم اور راست عقل کے مالک تھے۔"[1]

امام احمدؒ و امام شافعیؒ

امام احمدؒ کے فرزند عبداللہؒ کہتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ ابا جان سے پوچھا: یہ شافعی کون ہیں جن کے لیے آپ بکثرت دعا مانگتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: بیٹے، شافعیؒ دنیا کے لیے آفتاب اور نوعِ انسانی کے لیے سلامتی و عافیت کی مانند تھے، کیا ان دونوں چیزوں کا کوئی بدل ہو سکتا ہے؟

صالح بن امام احمدؒ کہتے ہیں کہ یحییٰؒ بن مَعین نے ایک دفعہ مجھ سے کہا: "کیا آپ کے والد (امام احمدؒ) اپنے رویے پر شرماتے نہیں؟ میں نے پوچھا: کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا: میں نے انہیں ایک روز اس حال میں دیکھا کہ شافعیؒ سوار ہیں اور یہ ان کی سواری کی لگام تھامے پیدل چل رہے ہیں۔" اس بات کا تذکرہ میں نے اپنے والد صاحب (امام احمدؒ) سے کیا تو انہوں نے کہا: اگر ملاقات ہو تو میری طرف سے انہیں کہہ دینا کہ اگر علم و تفقہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو آکر تم بھی دوسری طرف سے ان کی رکاب تھام لو۔[2]

ابو حمید بن احمد البصریؒ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ امام احمدؒ سے کسی مسئلے کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ ایک شخص نے ان سے کہا: ابو عبداللہ کیا اس بارے میں کوئی صحیح حدیث حدیث مروی نہیں۔ امام احمدؒ نے کہا: یہ درست ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی صحیح حدیث

۱۔ ایضاً، ص ۱۲۴

۲۔ ایضاً، ص ۱۲۴-۱۲۷

Marfat.com

موجود نہیں، مگر اس سلسلے میں امام شافعیؒ کا یہی قول ہے اور اس میں ان کی دلیل سب سے مضبوط ہے اور امام شافعیؒ وہ شخص ہیں جن سے ایک مرتبہ چند مسائل کے بارے میں ان کی راے پوچھی تو انہوں نے ان مسائل کے مدلل جوابات دیے اور جب میں نے ان کے مآخذ کے بارے میں پوچھا کہ اس سلسلے میں کوئی قرآنی آیت یا حدیث ہے؟ تو انہوں نے کہاہاں، اور پھر فوراً ایک حدیث پیش کر دی جس میں وضاحت کے ساتھ مسئلے کا حل موجود تھا۔[1]

امام احمدؒ کہتے ہیں: مجھے اگر کسی مسئلہ میں کسی حدیث کا علم نہیں ہوتا تو میں کہتا ہوں: اس بارے میں شافعیؒ کا قول یہ ہے، اس لیے کہ وہ قریش کے سربرآوردہ عالم اور امام ہیں۔[2]

داؤد بن علی اصبہانی، اسحاق بن راہویہؒ کا قول بیان کرتے ہیں کہ وہ مکہ مکرمہ میں امام احمد بن حنبلؒ سے ملے، امام احمد نے کہا: آیئے، میں آپ کو ایسے شخص کی زیارت کراتا ہوں، جس کی نظیر آپ کی آنکھوں نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ پھر انہوں نے میری (امام) شافعیؒ سے ملاقات کرائی۔[3]

ہوسکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ امام شافعیؒ کے بارے میں امام احمدؒ کی یہ راے اس لیے تھی کہ وہ ان کے استاد تھے لہٰذا کوئی شاگرد اگر اپنے استاد کا مداح اور اس کے علم و فضل کا معترف ہو تو یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں؛ لیکن دوسری طرف امام شافعیؒ بھی

۱۔ آداب الشافعي ومناقبه، ص۸۶-۸۷

۲۔ ایضاً، ص۸۶

۳۔ الانتقاء، ص۱۲۵

Marfat.com

امام احمد بن حنبلؒ کے فضل اور علم حدیث میں ان کی مہارت کے یکساں طور پر معترف تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ ان سے مخاطب ہو کر کہا تھا: آپ حدیث اور علم رجال کے متعلق خود مجھ سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں، اگر حدیث صحیح ہو تو مجھے اس کے متعلق آگاہ کریں، چاہے وہ حدیث کوفہ سے تعلق رکھنے والے کسی محدث نے روایت کی ہو یا بصرہ و شام سے تعلق رکھنے والے، اگر صحیح ہو گی تو میں اسے اختیار کر لوں گا۔[1]

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معاملہ استاد اور شاگرد کا نہیں تھا، اعترافِ کمال کا تھا۔

امام شافعیؒ جب امام احمدؒ سے کوئی روایت بیان کرتے تو تعظیماً ان کا نام نہ لیتے، بلکہ کہتے: ہمیں ہمارے ساتھیوں میں سے ایک ثقہ (قابل اعتماد) شخص نے یہ حدیث بتائی ہے وغیرہ۔[2]

خلاصۂ کلام

اس سرسری تذکرے سے اسلاف کرام کے آدابِ اختلاف کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان حضرات کے اعلیٰ اخلاق پر اجتہادی مسائل میں اختلافِ رائے کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہو سکا۔ اس لیے کہ ان کی تربیت درس گاہ نبوی میں ہوئی تھی جس کی وجہ سے نفسانیت ان پر غلبہ نہ پا سکی۔ آج جبکہ اپنے مسائل و معاملات میں ہم افتراق و انتشار کا شکار ہیں، ہمیں سلفِ صالحین کے ان بلند آداب اختلاف کے سایہ دار درخت کا سہارا لے کر اپنے آپ کو ان آداب و اخلاق سے آراستہ کرنا چاہیے، جن سے وہ متصف تھے۔ اسی پر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا انحصار ہے۔

۱۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۲۔ ابن جوزی، مناقب الإمام أحمد، ص ۱۱۶

Marfat.com

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ بعض مواقع پر ان آداب کا پورا لحاظ نہیں رکھا گیا؛ لیکن یہ طرزِ عمل بعد کی صدیوں سے متعلق ہے جب تقلید و تعصب کا چلن عام ہو چکا تھا۔ اس زمانے کے علما و مقلدین اختلاف کے پیچھے کار فرما اسباب کی حقیقت اور روح کو سمجھ نہ سکے اور ان آدابِ اعلیٰ کے مقصد و منشا تک رسائی حاصل نہ کر سکے جو صرف تلاشِ حق کے سچے جذبے کا نتیجہ تھے۔ غالباً امام غزالیؒ نے ایسے ہی افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے: وہ فقہا جو مطلوب تھے، اب طالب بن گئے۔ وہ حکمرانوں اور اُمرا سے دور رہنے کی وجہ سے باعزت تھے، مگر اب ان کی رضاجوئی کر کے ذلیل و خوار ہونے لگے ہیں۔

مطلوب شخص چونکہ اپنے نفس کا مالک ہوتا ہے، اس لیے وہ حق و راستی کی راہ پر گامزن رہتا ہے، جبکہ طالبِ دنیا ضمیر فروش ہوتا ہے، اس کے خریدار کو جو بات اچھی لگے، وہی اس کی زبان پر جاری ہوتی ہے۔ ایسے طالبانِ دنیا کی کارستانیوں ہی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جو فقہ اسلامی پر اثر انداز ہو کر اس دین کی فطرت و واقعیت اور فلاحِ انسانی کی رعایت ثابت کیا کرتا تھا وہی اختلاف ایک دردناک آزار۔۔۔ اور مسلمانوں میں تفریق و انتشار کا ایک خطرناک سبب بن گیا۔ بلکہ ایک عذاب جس نے امت مسلمہ کو بے فائدہ اور بے مقصد کاموں میں الجھا کر اس کی قوت و شوکت کے پرخچے اڑا دیے۔

گزشتہ صفحات میں جس اختلاف کے بعض گوشوں کا ہم نے جائزہ لیا اور اس دور کی شخصیات جن بلند آدابِ اختلاف کی حامل تھیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا، ان کے بارے میں مصنفین کی "اسبابِ اختلافِ فقہا" کے عنوان کے تحت بہت سی جدید و قدیم کتابیں موجود ہیں، لیکن وہ "خلاف" جو قرونِ خیر کے بعد سامنے آیا، وہ دوسری قسم کا ہے اور اس کے اسباب و وجوہ بھی مختلف ہیں۔

Marfat.com

Marfat.com

فصل ششم

قرونِ خیر کے بعد اختلاف اور اس کے آداب

چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں اجتہاد کا سورج غروب ہوتے ہی مخصوص فقہی مسالک کی تقلید کا چلن عام ہو گیا۔ چنانچہ ابو طالب مکی "قوت القلوب" میں کہتے ہیں:

لوگوں کی (یہ فقہی) تصانیف و تالیفات تو بعد کی چیزیں ہیں۔ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں لوگوں کے اقوال (بطور شرعی حجت) پیش کرنے کا رواج نہ تھا اور نہ یہ قاعدہ تھا کہ کسی ایک شخص کے مذہب پر فتویٰ دیا جائے؛ ہر مسئلے اور معاملے میں اسی کی آرا کو مانا اور بیان کیا جائے اور اسی کے مذہب کو مدار یقین قرار دے لیا جائے۔[1]

تیسری صدی ہجری میں، جبکہ اجتہاد کا عمل ابھی جاری تھا، اگرچہ بعض علما نے اپنے پیش رو اہل علم کے مقرر کردہ قواعد اور اصولوں کی روشنی میں مسائل کی تخریج اور استنباط کا کام ضرور انجام دیا، مگر ان کی شخصی تقلید یا صرف انھی کی آرا پر کبھی انحصار نہیں کیا۔

چوتھی صدی ہجری میں اس صورتِ حال میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی۔ اس وقت لوگوں کے دو طبقے تھے۔ ایک طبقہ علما اور دوسرا طبقہ عوام۔ عوام کا حال یہ تھا کہ وہ اجماعی اور اصولی مسائل میں، جو تمام مسلمانوں یا عام اربابِ اجتہاد کے درمیان متفق علیہ تھے، براہِ راست حضور اکرم ﷺ سے روایت کردہ احادیث کی پیروی کیا کرتے

۱۔ حجة الله البالغة، ص۳۲۱

Marfat.com

تھے، طہارت، نماز، روزے اور زکاۃ وغیرہ کے مسائل علما سے سیکھ لیتے اور اسی کے مطابق خود عمل کرتے اور جب کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آتا تو جو مفتی انہیں میسر آتا، بلا لحاظِ مسلک و مذہب، اس سے فتویٰ پوچھ لیتے۔

جہاں تک اہلِ علم اور خواص کا تعلق تھا، تو حدیث سیکھنے اور سکھانے کے عمل میں منہمک رہنے کی وجہ سے ان حضرات کے پاس احادیثِ رسولؐ اللہ اور آثار صحابہؓ و تابعین کا اتنا ذخیرہ ہوتا کہ اس کی موجودگی میں مسئلے کے حل کے سلسلے میں کسی اور چیز کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ البتہ روایات و آثار کے باہمی تعارض کی صورت میں اگر ترجیح کی کوئی شکل واضح نہ ہوتی اور وہ مطمئن نہ ہوتے تو فقہاے سابقین کے اقوال کی طرف رجوع کرتے اور اگر وہاں بھی انہیں کسی مسئلے میں مختلف آرا نظر آتیں تو اہلِ مدینہ یا اہلِ کوفہ میں سے جس صاحبِ علم کی راے کو دلیل کے لحاظ سے مضبوط اور مستند پاتے اسے اختیار کر لیتے تھے۔

جن علما میں مسائل کی تخریج کی صلاحیت ہوتی، وہ نئے پیش آمدہ مسائل کا حکم معلوم کرنے کے لیے فقہا کے مقرر کردہ قواعد کی روشنی میں اجتہاد و استنباط سے کام لیتے تھے، اور وہ جس مسلک کے قواعد کے مطابق استنباط کا کام انجام دیتے تھے، خود انہیں بھی اسی مسلک کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے پیش روؤں کی طرح صرف کسی ایک مکتبۂ فکر یا مسلک کی پابندی نہیں کرتے تھے، جیسا کہ بعد کے ادوار میں ہونے لگا۔ اسی نسبتِ مسلک کے لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ فلاں شافعی ہے اور فلاں حنفی، حتیٰ کہ کسی ایک مسلک سے زیادہ مطابقت کی وجہ سے محدثین کو بھی مختلف مسالک کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر نَسائی، بیہقی اور خَطّابی شافعی مکتبۂ فکر کی

Marfat.com

طرف منسوب کیے جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں بھی منصبِ قضا اسی کو سونپا جاتا جو اجتہادی بصیرت رکھتا تھا۔ نیز کسی عالم کو فقیہ اسی صورت میں کہا جاتا، جب وہ اجتہاد کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتا۔

چوتھی صدی ہجری کے بعد حالات کا رخ

چوتھی صدی ہجری میں حالات نے جو رُخ اختیار کیا، ان کا ذکر کرتے ہوئے حجۃ الاسلام امام غزالیؒ (متوفّٰی ۵۰۵ھ) کہتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جن خلفاے راشدین نے بارِ خلافت اٹھایا، انہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل تھی اور وہ احکام و معاملات میں کمال تفقہ کے حامل تھے۔ لہٰذا نئے پیش آمدہ مسائل میں وہ خود ہی فتویٰ دیا کرتے تھے اور دوسرے فقہا سے وہ صرف اسی صورت میں مدد لیتے جہاں مشورہ ناگزیر ہوتا۔ اس دور کے علماے کرام نے اپنے آپ کو علم آخرت کے لیے وقف کر لیا تھا۔ اور لوگوں کے مسائل و معاملات میں فتویٰ کے کام کو وہ ایک دوسرے پر ٹالنے اور خود کو پورے انہماک کے ساتھ اللہ کی یاد میں محو رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ خلفاے راشدین کا مبارک دور جب ختم ہو گیا تو زمامِ اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو نہ اس امانت کے اٹھانے کی صلاحیت رکھتے تھے اور نہ علم فتاویٰ اور احکامِ شریعت سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ اس لیے وہ مقدمات فیصل کرنے اور قضاے شرعی جاری کرنے کے لیے فقہا سے مدد لینے پر مجبور ہوئے اور ہر وقت انہیں اپنے ساتھ رکھنا ان کی ضرورت بن گیا۔ (گو خیر القرون کا دور ختم ہو چکا تھا، مگر پھر بھی) ایسے علما سے دنیا خالی نہ تھی جو قدیم رنگ پر مضبوطی

Marfat.com

سے قائم تھے اور اخلاصِ دینی کو اپنی عزیز ترین متاع سمجھتے تھے، حکومتیں انہیں جتنا بھی اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتیں، وہ ان سے اتنا ہی زیادہ دور ہوتے چلے جاتے۔

جاہ پسند لوگوں نے جب علما کی یہ آؤ بھگت دیکھی اور اپنے اعراض اور استغنا کے باوجود انہیں اربابِ حکومت کا مطلوبِ خاطر بنا ہوا پایا، تو ان کے دلوں میں بھی اس (ذریعۂ عزت و اقبال یعنی) علمِ دین کے حاصل کرنے کا انتہائی شوق چرایا، تاکہ اسے بازار میں لاکر عزت و شرف کا سودا کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ درباری علما و فقہا کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا۔ اور کل تک جو طبقہ سلاطین سے منہ موڑنے کی بدولت باعزت تھا، خود کوئے سلاطین کے طواف نے ان کی عزت ذلت میں بدل دی، الا ما شاء اللہ۔

اس زمانے میں چونکہ اسلامی ممالک اور علاقہ جات کے حالات و ضروریات کے پیشِ نظر فقہی مسائل اور علم فتویٰ کی اشد ضرورت تھی، لہٰذا اس دور میں علم فتویٰ پر سب سے زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ مگر بعد میں جب اصولِ عقائد اور علمِ کلام کے مناظروں میں دلچسپی لینے والے چند خلفا اور سلاطین پیدا ہو گئے تو یہ حضرات بھی علمِ کلام میں مشغول ہو گئے، انہی علوم و فنون کی کتابیں تصنیف کی جانے لگیں اور مناظروں اور مباحثوں کے طریقے مرتب کیے جانے لگے۔ جس طرح اہل فتویٰ کا دعویٰ تھا کہ ان کا مقصد لوگوں کے دینی مسائل کا حل پیش کرنا اور ان کی دین سے وابستگی کو برقرار رکھنا ہے، اسی طرح یہ لوگ بھی اپنی اس

Marfat.com

ساری جدوجہد کا مقصد یہ بیان کرتے تھے کہ وہ بھی اس ذریعے سے اللہ کے دین اور سنتِ نبوی کو بدعات وخرافات سے پاک رکھنا چاہتے ہیں۔

جب تک اس میدان میں اہل علم کا غلبہ رہا، اس علم کی بنیادیں بھی استوار رہیں۔ مگر پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ناپختہ کار لوگ بھی علم کلام میں دخل اندازی کرنے اور مناظروں میں دل چسپی لینے لگے جس سے تعصب و تشدد سے بھرپور جنگ وجدال کے مناظرے ہونے لگے اور نوبت قتل وغارت تک پہنچ گئی۔

رفتہ رفتہ جدل (بحث مباحثے) اور مناظروں کا شوق لوگوں میں اس قدر بڑھ گیا کہ بعض ناپختہ افراد نے فقہی مسائل میں بھی اس طرزِ عمل کو رواج دیا۔ انہیں اس بات کی وضاحت کا بڑا شوق تھا کہ فلاں مسئلہ میں اولیٰ مسلک، مسلکِ حنفی ہے یا مسلکِ شافعی؟ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اربابِ فن، کلام اور دیگر علوم کے میدانِ تحقیق و جستجو سے نکل کر اختلافی مسائل فقہیہ کے معرکے میں اتر آئے، جہاں خاص طور سے حنفی اور شافعی مذاہب کو مناظروں کے لیے منتخب کر لیا گیا جبکہ امام مالک، امام احمد بن حنبل، سفیان ثوری[1] اور دوسرے ائمہ کے مذاہب سے مناظرانہ موشگافیوں کے لیے لوگوں نے دلچسپی نہ لی (جس کا واضح سبب غالباً یہ تھا کہ امرا و خلفا کو صرف حنفیت اور شافعیت ہی کے مناظروں سے دل چسپی تھی)۔

ستم یہ کہ (وہ اپنی ان مساعی پر نازاں بھی تھے اور) ان کا خیال تھا کہ وہ اس طرح شریعت کے نہ صرف یہ کہ اسرار و رموز کی کھوج لگا رہے ہیں، بلکہ ہر مذہب کے علل اور مصالح بیان کر کے اصولِ فتویٰ کو مدون کرنے کی راہ ہموار

۱۔ امام غزالی کی رائے کے مطابق ائمہ مجتہدین پانچ ہیں، اور پانچویں سفیان ثوریؒ ہیں۔

Marfat.com

کر رہے ہیں۔ اس خیال کے تحت انہوں نے تصنیفات اور استنباطات کا ڈھیر لگا دیا اور بحث و جدال کے گوناگوں اسلحے ایجاد کر ڈالے۔ افسوس کہ وہ اب تک اس روش پر چلے جا رہے ہیں اور نہیں معلوم کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے۔[1]

مندرجہ بالا اقتباس کا جائزہ لینے سے ہمیں درج ذیل چند چیزیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ امام غزالی نے خلفاے راشدین کے بعد امت مسلمہ کو لاحق ہونے والے اصل روگ کی بنیاد فکری اور سیاسی قیادت کے الگ الگ ہو جانے کو قرار دیا ہے، جو ہماری تاریخ کا ایک ایسا بدنما داغ ہے جسے آج تک دور نہ کیا جا سکا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف اسلامی سیاست سے ناواقفیت کی بنا پر حکمران غیر اسلامی سیاسی حرکتوں کا ارتکاب کرتے رہے اور دوسری طرف ہماری فقہ میں ایسے فرضی مسائل کی بھرمار ہو گئی جن کا نہ تو عملی زندگی سے کوئی تعلق تھا اور نہ ہی وہ روزمرہ زندگی کا اس طریقے پر کوئی حل پیش کرتے تھے جس طرح صحابہ و تابعین کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ فقہ و اصولِ فقہ کے ضمن میں مذکور مسائل میں سے زیادہ تر حصہ ان فرضی مسائل کا ہے جنہیں اختلاف اور مناظرہ بازی نے جنم دیا۔

۲۔ فقہ اسلامی، جو شریعت کے مقرر کردہ قواعد و ضوابط کے تحت لوگوں کو روزمرہ زندگی میں پیش آمدہ مسائل کے حل کا ذریعہ تھی، رفتہ رفتہ حکومتِ وقت (چاہے اس کی نوعیت اور بنیاد کچھ بھی ہو) کی مددگار اور معاون بن کر اس کے ہر اقدام کے لیے وجہِ جواز فراہم کرنے کا ایک آلہ بن گئی۔ اس کا نتیجہ مسلمانوں کے قانونی نظام میں خلل اور عجیب قسم کی ناہمواری کی صورت میں نکلا۔ یہاں تک کہ ایک ہی شخص کا کوئی

۱۔ إحياء علوم الدين ۱: ۴۱ ومابعد، الباب الرابع: في سبب إقبال الخلق على علم الخلاف

Marfat.com

عمل ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں کسی کے ہاں جائز اور کسی کے ہاں ناجائز قرار پانے لگا۔ اس کا ثبوت کتبِ فقہ میں أبو اب المخارج والحیل[1] (شرعی احکام سے راہِ فرار کے راستے اور حیلے بہانے) کے نام سے وہ قواعد اور مثالیں ہیں جن سے ان کتابوں کے سینکڑوں اوراق کالے کیے گئے اور جن میں مہارت کسی بھی فقیہ کے علمی مرتبہ و مقام اور برتری کی دلیل ہوا کرتی تھی۔ پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا، دین کی گرفت کمزور پڑتی گئی اور معاملہ شدت اختیار کرتا گیا۔ دوسری طرف مسائلِ شرعیہ کی بابت لوگ تساہل برتنے لگے۔ یہاں تک کہ بعض مفتی حضرات ایسے فتوے بھی

۱۔ مخارج و حیل فقہ حنفی کے اصول میں بھی داخل ہے۔ امام محمد نے اس موضوع پر المخارج والحیل کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی، لیکن بعد کے ادوار میں اس شکل نے ضرورت سے زیادہ وسعت اختیار کرلی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: باب الحیل، إعلام الموقعین اور الحیل فی الشریعة الإسلامه از محمد بحیری (مقالہ ڈاکٹریٹ)۔ فقہ کی تقریباً تمام کتابوں میں اس باب یا اس کی کچھ صورتوں کا ذکر مسائل نکاح و طلاق و معاملات وغیرہ میں ملتا ہے۔ اعلام الموقعین میں ایک مستقل باب ہے اور جزو سوم اور چہارم میں بھی اس کا کچھ ذکر موجود ہے، جس میں حیلوں کی حقیقت، اس کی قسمیں، ہر ایک کا حکم اور پھر بہت ساری مثالیں دی گئی ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں: کوئی قاتل اپنے اوپر سے قصاص ساقط کرنا چاہے اور اس کے لیے یہ صورت اختیار کرے کہ جسے قتل کرنا ہو اس کے جسم میں زخم لگا کر کوئی زہر آلود دوا اس میں ڈال دے یا اور کسی طرح سے اس کو زہریلا زخم لگا دے تو اربابِ حیل کہتے ہیں کہ اس پر قصاص واجب نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اسے قاتل نہیں مانا جائے گا۔ کوئی شخص اپنے مرضِ موت میں بیوی کو محرومِ وراثت رکھنا چاہے اور اس عالم میں اگر اسے طلاق دے دے تو قاضی اسے حصۂ وراثت دلائے گا، کیونکہ مرض موت کی طلاق معتبر نہیں۔ لیکن اربابِ حیل کہتے ہیں کہ بجائے طلاق دینے کے وہ یہ اقرار کرلے کہ اس نے بیوی کو تین طلاق دی تھیں۔ اسی طرح بعض مال دار زکاۃ نہ دینے کے لیے اپنا مال عارضی طور پر کسی کو دے دیتے ہیں یا سال پورا ہونے سے پہلے اسے بیچ دیتے ہیں یا اپنی زکاۃ کسی تھیلی یا برتن میں رکھ کر اسے فقیر و محتاج کو دیتے ہیں، گویا انہیں زکاۃ ادا کر دی اور پھر اس سے واپس لے لیتے ہیں۔ یہ تمام صورتیں حرام اور ناجائز ہیں۔ انسان کا معاملہ تو اس ذات سے ہے جو علیم و خبیر ہے اور وہ دل و نگاہ کے سارے پوشیدہ رازوں تک کو اچھی طرح جانتی ہے۔

Marfat.com

صادر کرنے لگے، جن کے متعلق ان کے پاس نہ صرف یہ کہ کوئی دلیل نہیں ہوتی تھی، بلکہ فتوے کی درستگی کا خود ان کو بھی یقین نہیں ہوتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ دیتے کہ اس میں لوگوں کے لیے تخفیف اور نرمی ہے، یا ایسی سختی ہے جس کی وجہ سے شرعی حدود سے تجاوز کو روکا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ حکومتِ وقت کے بعض کار پردازوں کو ایسی رخصتیں دیتے جو عام مخلوق کے لیے نہیں ہوتیں۔[1]

کوئی شخص عورت کو یا عضوِ تناسل کو چھونے کے بارے میں سوال کرتا تو جواب ملتا کہ امام ابو حنیفہؒ کے ہاں اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

شطرنج کھیلنے یا گھوڑے کا گوشت کھانے کے بارے میں پوچھا جاتا تو کہتے: امام شافعیؒ کے نزدیک یہ جائز ہے۔

ملزم کو مار پیٹ کرنے یا تعزیر دینے میں حدود سے تجاوز برتنے کے متعلق سوال کیا جاتا تو کہا جاتا: امام مالکؒ اسے جائز ٹھہراتے ہیں۔

کسی وقف کی جائداد کی ملکیت، جب وہ بے کار ہو جائے، اس سے استفادہ ممکن نہ ہو اور متولی کے پاس اسے دوبارہ آباد کرنے کے لیے رقم بھی نہ ہو، تو اسے بیچنے کے لیے کوئی راستہ نکالنے کے لیے فتویٰ دیا جاتا کہ امام احمد کے مسلک کے مطابق اسے بیچنا جائز ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہلِ خیر کی طرف سے وقف کردہ املاک ذاتی ملکیت میں تبدیل ہونے لگیں۔[2]

۱۔ محمد سلّام مدکور، مناهج الاجتهاد في الإسلام، ص۴۵۰- ۴۵۱؛ أحمد كبيسي، أصول الأحكام، ص۳۹۰

۲۔ امیر شکیب ارسلان، الارتسامات اللطاف في خاطر الحاج إلى أقدس مطاف

Marfat.com

اللہ کے خوف اور تقویٰ کے جذبے میں جوں جوں کمی آتی گئی، مقاصدِ شریعت اور شرعی قواعد وضوابط سے بھی غفلت اور روگردانی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ کچھ دریدہ دہن، گمراہ اور اباحیت زدہ شعرا احکامِ الٰہی کا مذاق اڑانے لگے، چنانچہ ابو نواس کہتا ہے:

أباح العراقيُّ النبيذ وشربه وقال: حرامان المدامة والسكر
وقال الحجازي: الشرابان واحد فحلّت لنا من بين قوليهما الخمر
سآخذ من قوليهما طرفيهما وأشربها لأفارق الوازر الوزر

(عراقی فقیہ کہتا ہے کہ نبیذ اور اس کے مشروب کا استعمال جائز ہے، البتہ شراب اور نشہ حرام ہے۔ حجازی فقیہ کہتا ہے کہ دونوں ایک ہی ہیں۔ اب دونوں باتوں سے شراب ہمارے لیے حلال ہوگئی۔ لہٰذا میں دونوں اقوال میں سے ہر ایک کا ایک ایک حصہ اختیار کرتے ہوئے شراب پیوں گا۔ اس طرح اس کے استعمال کی ذمہ داری سے بھی محفوظ رہوں گا)۔

علما جن کا کام حدودِ دین کی حفاظت کرنا ہے، اگر وہی لوگوں کی نظر سے گر جائیں تو لوگوں کے دلوں میں دین کی کیا اہمیت باقی رہے گی؟ اس طرح نرمی اور آسانی پیدا کرنے کے دعوے کی بنیاد پر دین کی حدود کو پھلانگنا ایک ایسا جرم ہے جس کی لوگوں کی نظر میں یقیناً کوئی حیثیت اور وقعت نہیں ہوتی۔ دوسری طرف اربابِ فتویٰ نے جب ہیبت وعظمت کی دیوار خود اپنے ہاتھوں سے ڈھادی اور ان کے فتووں میں نفسانیت کا جذبہ غالب آنے لگا، تو ان کی سہل انگاری کے مقابلے میں ایک اور جماعت پیدا ہوگئی، جو فتوے وغیرہ میں انتہائی شدت اور سختی کی علم بردار تھی۔ ان کے نزدیک سائلوں کو مشکل احکام بتلانا خدمتِ دین سمجھا جانے لگا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح لوگوں کو

Marfat.com

عزیمت کی راہ اپنانے پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اکثر اوقات نتیجہ ان کی امنگوں کے برعکس نکلتا۔ لوگ دین کی پیروی میں جب آسانی کے بجائے مشکل اور تنگی محسوس کرتے تو وہ دین ہی سے متنفر ہو کر اس پر عمل پیرا ہونے سے کنارہ کش ہو جاتے۔

اندلس کے ایک حکمران کا واقعہ ہے کہ اس نے مالکی مسلک کے عظیم مفتی (امام مالک کے شاگرد، موطأ کے راوی اور بلادِ مغرب (شمال مغربی افریقا) میں مالکی فقہ کو پھیلانے والے) یحییٰ بن یحییٰ (متوفیٰ ۲۳۴ھ) سے رمضان کے روزے کے دوران مجامعت کا کفارہ پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اس پر آپ لگاتار دو مہینے تک روزے رکھیں اور اس کا کوئی بدل بھی نہیں۔ حالانکہ شریعت میں کفارہ ادا کرنے کے سلسلے میں پہلا درجہ غلام آزاد کرنے کا ہے، انہیں یہی فتویٰ دینا چاہیے تھا، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ جب اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا: بادشاہ سینکڑوں غلام آزاد کر سکتا ہے، اس لیے اس کے لیے سخت حکم ضروری ہے اور وہ ہے روزہ۔[1]

اگر ہم تھوڑا سا بھی غور و فکر کریں تو ہم پر واضح ہو جائے گا کہ اسلام ایک حقیقت پسند دین ہے اور اس کے احکام میں سہولت اور آسانی کا پہلو مد نظر رکھا گیا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ لوگ برضا و رغبت اس کے احکام کی پیروی کریں اور انہیں کسی مشقت و تکلیف میں مبتلا نہ کیا جائے۔ ساتھ ہی وہ انہیں خواہشاتِ نفس کی پیروی کے لیے بالکل آزاد بھی نہیں چھوڑ دیتا۔ اگر یہ چیز پیش نظر رہے تو افراط و تفریط کی دونوں صورتوں کا شارع کے مقصود کے خلاف ہونا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

۱۔ البداية والنهاية ۱۰: ۳۱۲

Marfat.com

علماے دین کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو لوگوں تک بالکل اسی شکل میں پہنچائیں جس طرح اس نے اپنے رسول کے ذریعے اسے نازل فرمایا ہے، انہیں بے جا تشدید و تخفیف کا کوئی اختیار نہیں ﴿قُلْ أَتُعَلِّمُونَ اللهَ بِدِينِكُمْ﴾ [الحجرات۴۹: ۱۶] (کہو: کیا تم اللہ کو اپنا دین سکھا رہے ہو؟)، ﴿قُلْ أَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللهُ﴾ [البقرۃ۲: ۱۴۰] (کہو: تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟)۔

اللہ کے نزدیک جو چیز مقبول و معتبر ہے، وہ بلا چوں وچرا اس کے احکام کی پیروی و اتباع ہے اور جو چیز اس کلیہ سے ہٹ کر ہو، وہ بدعت شمار ہوگی، چاہے وہ تشدید و تکلیف کی شکل میں ہو یا تخفیف اور نرمی کی شکل میں۔

تقلید اور اس کے نتائج

اجتہاد کے متعلق جو نئی صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی، اس کا مختصر سا تذکرہ ہم پچھلے مباحث میں کر چکے ہیں۔ یہی وہ صورتِ حال تھی جس کے پیش نظر صلحاے امت کو خطرہ ہوا کہ اس دروازے سے کہیں ایسے لوگ بھی اس میدان میں داخل نہ ہو جائیں جو اس کی اہلیت سے بہرہ ور نہ ہوں، کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ فتویٰ کا کام اب ایسے لوگ بھی انجام دینے لگے تھے جو نہ صرف یہ کہ امرا و سلاطین کے پروردہ تھے، بلکہ وہ نفسانی خواہشات کے زیرِ اثر نصوص و احکام کی گردنیں مروڑنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف علما میں بھی دو طرح کے طبقے پیدا ہوگئے تھے۔ ایک طبقہ نے شدت اور سختی کی راہ اختیار کر لی تھی، اور دوسرے طبقہ نے رخصت و تخفیف کی راہیں نکال لی تھیں۔ یہ وہ عوامل تھے جنہوں نے امت کے بہی خواہوں کو ان خطرات کا احساس دلایا جو اسلام اور مسلمانوں کے انجام کے بارے میں واضح طور پر ابھر کر سامنے

Marfat.com

آچکے تھے۔ حالات کا بغور جائزہ لینے اور خطرات کی سنگینی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ امت کو تقلید کا پابند بنا کر اس پر اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ مگر یہ کتنی بڑی بد نصیبی ہے کہ ایک خرابی سے بچنے اور بحران سے نکلنے کے لیے امت کو تقلید کے قعرِ مذلت میں دھکیل دینا ہی بہترین علاج تصور کر لیا گیا۔

فقہا کی باہمی لا حاصل مناظرہ بازیوں، مباحثوں، ایک دوسرے کی مسلسل مخالفت اور کشاکش کی صورتوں سے چھٹکارا پانے کا انہیں یہی راستہ نظر آیا کہ اختلافی مسائل میں لوگوں کو متقدمین کے اقوال و آرا سے رجوع کا پابند بنایا جائے۔ اسی طرح سلاطین کے تقرب، طلبِ دنیا کی دوڑ اور اپنے فیصلوں میں راہِ راست سے انحراف کی وجہ سے قاضیوں پر سے بھی لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا تھا، لہٰذا جب تک ان کا فیصلہ ائمۂ اربعہ میں سے کسی کے قول کے مطابق نہ ہوتا، اسے قابلِ قبول نہیں سمجھا جاتا تھا۔

خوفِ خدا سے عاری شرعی علوم کے وہ حاملین جو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے اجتہاد کو ایک ذریعہ سمجھتے تھے، اس سے بچنے کی خاطر عام مسلمانوں کے لیے ائمہ اربعہ کی تقلید، ان کے اقوال کی پابندی اور ان کے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں مسائل کا استنباط ہی واحد محفوظ طریقہ رہ گیا تھا۔ یہاں تک کہ امام الحرمین (متوفیٰ ۴۷۸ھ) نے دعویٰ کیا کہ محققین کا مشہور صحابہ کرام تک کی تقلید سے ممانعت پر اجماع ہو چکا ہے، لہٰذا اب ان ائمہ ہی کے مسالک کی اتباع کے سوا کوئی چارہ نہیں، جنہوں نے تحقیق و جستجو اور غور و فکر سے کام لے کر منضبط ابواب قائم کیے، مسائل کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لیے متقدمین کے اقوال و آرا کو پرکھنے کے بعد انہیں اپنے لیے مشعلِ راہ بنا کر تمام قواعد و ضوابط مرتب کیے۔ اس پر امام

Marfat.com

الحرمین نے زور دیا اور یہ عجیب و غریب نتیجہ نکالا کہ عام آدمی ائمہ مجتہدین کے مکاتبِ فکر کی اتباع کا پابند ہے![1]

امام الحرمین کے اس قول اور اجماع کے متعلق ان کے دعوے پر انحصار کرتے ہوئے مشہور محدث وفقیہ ابن الصلاح (متوفیٰ ۶۴۲ھ) نے ائمہ اربعہ کی تقلید کو واجب قرار دیا۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان ائمہ اربعہ کے مسالک منضبط اور مدون شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں اور ان کے تمام اصول و شرائط بھی کتابوں میں محفوظ ہیں، جبکہ یہ بات صحابہؓ و تابعینؒ کے اقوال میں نہیں پائی جاتی۔[2] بعد میں آنے والے علماو محققین ان کی یہ بات اب تک نقل کرتے چلے آئے ہیں۔[3]

یہیں سے ایک لحاظ سے کتاب و سنت کے علوم سے لوگوں کی غفلت و بے اعتنائی کا آغاز ہوا۔ اب لوگ صرف اقوال و مسالک کو بیان کرنے، ان کے اصول و ضوابط مرتب کرنے، ان کا دفاع کرنے، ان سے مزید جزئیات نکالنے اور استنباط کرنے پر اکتفا کرنے لگے۔

زوال و انحطاط کا یہ عمل جاری رہا۔ اختلافات میں شدت آتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ تقلیدِ خالص پر صدیاں گزر گئیں۔ اس سے فکری تحریک رک گئی۔ اجتہاد کے سوئے خشک ہو گئے۔ فتنوں اور جہالت کا دور دورہ ہو گیا۔ لوگوں کی نظر میں فقیہ اور عالم وہ

۱۔ امام الحرمین الجوینی، البرہان ۲: ۱۱۲۶؛ ابن امیر الحاج، التقریر والتحبیر ۳: ۳۵۳

۲۔ التقریر والتحبیر ۳: ۳۵۳

۳۔ ایضاً؛ شرح جوہرۃ التوحید تحفۃ المرید، ص ۱۵۲

Marfat.com

قرار پایا جس نے فقہاے سابقین کے اقوال و آرا کو قوی اور ضعیف کی چھان پھٹک کیے بغیر ازبر کر رکھا ہو۔ اور محدث وہ ٹھہرا جسے چند صحیح اور ضعیف احادیث یاد ہوں۔

اسی پر بس نہیں بلکہ حالات اس سے کہیں بڑھ کر روبا نحطاط ہونے لگے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا مسلم معاشرے سے آفتابِ علم ہی غروب ہو گیا تھا۔ سوچ و فکر کی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں، بدعات کا بازار گرم ہو چکا تھا، اور انحراف و بے راہ روی کے ذرائع و وسائل نے خوب رواج پالیا تھا۔ خرافات کی مختلف شکلیں مسلمانوں میں پھیل گئی تھیں، جس نے دشمن حملہ آوروں کے لیے اس بات کی راہ ہموار کر دی کہ وہ مسلم آبادیوں اور شہروں پر قبضہ جما کر اسلامی تہذیب و تمدن کو ہی ملیامیٹ کر دیں۔

ماضیِ قریب میں مسلمانوں کا طرزِ فکر و عمل

فکری جمود و تقلید کی گود میں محوِ استراحت مسلمان ماضی کے سنہرے خوابوں کا جال ہی بنتے رہے اور دینی اور سیاسی قیادت کی راہیں الگ ہو جانے کی وجہ سے وہ حیران و سرگرداں مختلف راہوں پر بھٹکتے رہے؛ جبکہ اہلِ علم ان سے غافل ہو کر اپنی دنیا میں مگن ہو گئے اور اپنے تئیں یہ سمجھتے رہے کہ انہی کی راے ہی سب سے فائق اور درست ہے۔ جو شخص بھی اس امت کے روشن ورثے سے واقفیت رکھتا ہو، اس کے لیے یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جمود و تعطل کے شکار یہ پس ماندگان انہی اسلاف کے وارث ہیں جو متحرک اور روشن و تابندہ فکر اور طرزِ حیات کے مالک تھے۔

اقوامِ یورپ نے جب خوابیدگی کا لبادہ اتار پھینکا اور ترقی کی راہ پر نئی کروٹ لی اور استعماری پالیسی اپنائی تو مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر انہوں نے سمجھ لیا کہ جس قوم سے ان کا مقابلہ ہے اس کی حقیقی بنیادیں اب کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ اعتقاد و ایمان کی چنگاری

Marfat.com

بجھ رہی ہے۔ یقین و اذعان کی پرانی کیفیت باقی نہیں رہی۔ اخلاق و کردار میں کجی راہ پاچکی ہے۔ استقامت و پامردی معدوم ہے، فکر و اجتہاد اور تفقہ و بصیرت کا فقدان ہے، بدعات کا دور دورہ ہے، سنت سے لوگ غافل ہیں اور شعور و بیداری کا دور دور تک کوئی نام و نشان ہی نہیں۔ گویا یہ امت وہ امت ہی نہیں رہی جس کی شان و شوکت سے وہ اب تک مرعوب چلے آرہے تھے؛ تو انہوں نے موقع غنیمت جانا اور مسلم ممالک پر قبضہ جماکر زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور امت کے تشخص کی بنیادوں میں سے جو تھوڑا بہت باقی بچ گیا تھا اسے بھی نیست و نابود کر ڈالا۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی ذلت و خواری کی جو کیفیت بنی وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہمارے اوپر حکومتوں کی باگ ڈور ہمارے دشمنوں کے ہاتھ میں ہے، وہی ہمارے مقدر کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں اور ہم اپنے ہی ہاتھوں سے پیدا کردہ مشکلات و مسائل کا حل ان کے پاس ڈھونڈتے ہیں۔

اس عرصے میں بچے کھچے شعور کی بدولت مسلمانوں میں اپنے زوال سے نجات پانے اور لغزش سے بچنے کی چند کوششیں ضرور ہوئیں لیکن ان کی ہر کوشش سخت ناکامی سے دوچار ہوئی۔ اس لیے کہ انہوں نے کامیابی کی مطلوبہ شرائط پوری نہیں کیں۔ یہ کوششیں چونکہ غیروں کی تقلید اور فاتح اقوام کی اندھی پیروی ہی کے نتیجے میں وجود میں آئی تھیں، اس لیے حالات سازگار ہونے کے بجائے مزید ابتر ہوگئے۔ البتہ یہ بات خوش آئند ہے کہ اب مسلمانوں کی نئی نسل اس مرض کے لیے مرہم شافی اور صحیح حل کی تلاش کے لیے کوشاں ہے۔ چنانچہ فرزندانِ امت کے چند معتد بہ گروہوں کو اس بات کا پختہ شعور آگیا ہے کہ إن آخر هذه الأمة لن يَصلُح إلا بما صلُح به أوّلها (اس امت کے پچھلے افراد کی اصلاح بھی اسی سرچشمۂ ہدایت ہی سے ممکن ہے کہ جس سے اس کے

Marfat.com

اولین افراد کو ہدایت نصیب ہوئی تھی)۔ اس لیے انہوں نے اگلوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اسلام کے چشمہ شیریں سے سیراب ہونا شروع کیا ہے۔ الحمد للہ اس بیداری کا آغاز ہو چکا ہے، جسے اسلامی بیداری (یا اسلام کی نشأۃ ثانیہ) کا نام دیا گیا ہے۔

دشمنانِ دین مختلف مذاہب و افکار رکھنے کے باوجود اس دعوتِ مبارکہ کے لیے میدان کیوں کر خالی چھوڑ سکتے تھے۔ ہمارے ساتھ جنگ کے لیے ان کے پاس اسلحہ کی بے شمار قسمیں ہیں۔ ہمارے کچھ بھائی بند بھی ان کا ایک ہتھیار ہیں، جو ان دشمنوں کے ہاتھوں آلۂ تخریب بننے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ اس بات کا ثبوت وہ بہت سے ادارے ہیں جن کا کام صرف اور صرف دین دار طبقوں کے خلاف سازشوں کے جال بُننا ہے۔ وہ اسلامی نشأۃ ثانیہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے اور اسے خطرناک چیلنجوں سے دوچار کر دیتے ہیں۔

دوسرے چیلنج اور رکاوٹیں ہی داعیانِ حق کی کوششوں کی بربادی کے لیے کافی تھیں کہ پھر اس بیداری کو اختلاف کے ہولناک چیلنج کا سامنا کرنا پڑا جس کی چٹان سے ٹکرا کر ان کی ساری کوششیں پاش پاش ہو گئیں۔ چنانچہ ہمیں نظر آتا ہے کہ مسلم نوجوان مختلف جماعتوں اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ کوئی اپنے آپ کو سلفی کہتا ہے تو کوئی اپنے آپ کو اہل حدیث۔ کچھ اپنے آپ کو مذہبیت کی طرف منسوب کرتے ہیں اور کچھ مذاہب و مکاتبِ فکر سے الگ تھلگ رہنے کے دعوے دار ہیں۔ ہر ایک دوسرے پر کفر و فسق، بدعت و انحراف، جاسوس اور کسی کا آلہ کار وغیرہ ہونے کے ایسے الزامات عائد کرتے رہتے ہیں جو کسی مسلمان کو اپنے دوسرے بھائی پر ہرگز چسپاں نہیں کرنے چاہییں؛ چہ جائیکہ ان کی تشہیر کے لیے ہر ممکن وسائل کو بروے کار لایا جائے اور اس

Marfat.com

طرح جان بوجھ کر یا لاعلمی میں کسی کو اس کی پروا نہیں رہی کہ اسلام کی بیخ کنی کے لیے دوسرے حلقوں کی طرف سے جو کوششیں ہو رہی ہیں، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے معمولی اختلافات کہیں زیادہ خطرناک نہ ثابت ہوں۔

ائمۂ مجتہدین کے اختلاف کا جواز موجود تھا۔ مناسب اسباب کی وجہ سے ان کا اختلاف بعض آداب و قواعد کا بھی پابند تھا، لیکن معاصرین کے اختلاف میں کوئی ایک بھی معقول وجہ نہیں جو ان حضرات کے ہاں پائی جاتی تھی۔ کیونکہ یہ اجتہاد کی صلاحیت سے بے بہرہ اور نرے مقلد ہیں۔ ان میں وہ بھی شامل ہیں جو تقلید سے براءت کے بلند و بانگ دعوے کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تقلید کیے بغیر کتاب و سنت سے براہِ راست احکام اخذ کرتے ہیں، حالانکہ ان کا انحصار حدیث کی چند کتابوں پر ہوتا ہے۔ اور حدیث کی سند اور متن کے بارے میں وہ ان کتابوں کے مؤلفین کی پوری طرح تقلید کرتے ہیں اور ان کتابوں میں استنباط کردہ مسائل اور فقہا کے نقل کردہ اقوال میں ان کی پیروی کرتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے حضرات اپنے آپ کو رجالِ حدیث، مراتب جرح و تعدیل اور تاریخ رجال کا ماہر سمجھتے ہیں، جبکہ اس بارے میں ان کا مبلغ علم یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس موضوع پر اس کے کسی ماہر کی زیادہ سے زیادہ ایک کتاب کا مطالعہ کیا ہوتا ہے، جس کی بنیاد پر وہ اپنے لیے منبرِ اجتہاد پر فائز ہونے کو جائز سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے اونچا سمجھ بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ جس شخص کے پاس تھوڑا سا علم بھی ہو، اسے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو جاہلوں کی روش سے دور رکھے، لوگوں پر الزام تراشی اور القاب بانٹنے سے باز رہے۔ امت کے اساسیات کو درپیش چیلنجوں کی خطرناکی کو محسوس کر کے ان کا دفاع کرے اور لوگوں کے اندر

Marfat.com

اتحاد و اتفاق کی روح بیدار کرنے کے لیے تگ و دو کرے۔ اور نہیں تو کم از کم آدابِ تقلید کا ہی خیال کرتے ہوئے وہ تمام لوگ جو تقلید کرتے ہیں اور مختلف ائمہ کے اقوال پر عمل کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور ایسا کون ہے جو آج کسی نہ کسی صورت میں کسی کا مقلد نہ ہو (اگرچہ کچھ لوگوں کا دعویٰ کچھ اور ہے) انہیں کم از کم ان اصول و آداب کی پابندی کرنی چاہیے جن کے گوشۂ عافیت میں ائمہ کرام نے اپنی زندگیاں بسر کیں۔

دینی درد رکھنے والے مسلمانوں کو اس بیداری سے یہ امید ہو چلی تھی کہ کفر و الحاد کے حامل نظریات اور باطل عقائد نے جو خلیج امتِ مسلمہ کے وجود میں پیدا کر دی ہے اور جس نے امت کے ایک بڑے گروہ کے دلوں اور سوچ و فکر کی صلاحیتوں کو غلط راہ پر ڈال رکھا ہے، اسے پاٹنے کی کوئی راہ ضرور نکل آئے گی۔ آثار ایسے نظر آرہے تھے کہ قلوب ضلالت و گمراہی سے نجات پاکر صحیح اسلامی عقائد سے روشن اور منور ہو جائیں گے، جس کے بعد اس وسیع دنیا کو خدائی پیغام سے روشناس کرایا جاسکے گا اور زمین کے گوشے گوشے میں کلمۂ حق سربلند ہو گا۔ لیکن یہ دیکھ کر دل تڑپ اٹھتا ہے کہ بعض مسلمان ہی اس بیداری کے بال و پر نوچ رہے ہیں اور اسے بے لگام اختلاف کی بیڑیاں پہنا رہے ہیں۔ چند ایک ایسے مسائل کو چھوڑ کر جو بجا طور پر سبب اختلاف بن سکتے ہیں زیادہ تر مسائل ایسے ہیں جن میں اختلاف کی گنجائش بہت ہی محدود ہے۔ لیکن پھر بھی بہت سے مسلمان اس میں الجھے ہوئے ہیں اور ان کی وجہ سے اپنی طاقت و قوت کو تباہ و برباد کیے جا رہے ہیں۔ اس اختلاف نے ان کی آنکھوں پر تعصب کی وہ پٹی باندھ دی ہے جس سے ان میں معمولی اور اہم اور چھوٹے اور بڑے کی کوئی تمیز باقی نہیں رہی۔ جس قوم کا یہ حال ہو چکا ہو، اس سے یہ امید کیوں کر کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے

Marfat.com

مسائل میں ترجیحات کا تعین کرکے ان کے حل کی کوششوں کو مربوط و منظم کر سکے گی، تاکہ اسلامی نشاۃ ثانیہ کے آغاز کو مضبوط بنیادیں فراہم ہو سکیں۔

مسلمانوں کی صفوں میں اختلافات کو بھڑکانا، انہیں ہوا دینا یا ان کے اسباب مہیا کرنا اسلامی اہداف و مقاصد کے ساتھ بہت بڑی خیانت، موجودہ اسلامی بیداری کی راہ میں بڑی رکاوٹ اور داعیانِ حق کی کوششوں کو سبوتاژ کرنے کے مترادف ہے، جو اللہ تعالیٰ کو بالکل پسند نہیں۔ اس لیے ایمان کے بعد (عام مسلمانوں کا عموماً اور داعیوں کا خصوصاً) سب سے بڑا اور اہم فریضہ یہ ہے کہ تمام اسلامی گروہوں اور دعوتِ اسلامی کے میدان میں سرگرم گروہوں اور افراد کو متحد کرنے کا کام انجام دیں اور ان کے باہمی اختلافات کو ختم کرائیں۔ اگر کہیں اختلاف ناگزیر ہو تو بھی اس کا دائرہ محدود رکھنے کی کوشش کریں اور سلف صالحین کے آداب کا ہر طرح خیال رکھیں۔ نیت اگر درست ہو تو اختلاف رائے کے باوجود اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے دل باہم مل سکتے ہیں۔ اللہ کی مکمل مدد و نصرت اور توفیق بھی تبھی حاصل ہو سکے گی۔

عہدِ حاضر میں اسبابِ اختلاف

یہ بات مسلّم ہے کہ زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ اسبابِ اختلاف بھی بدلتے رہتے ہیں۔ مگر گزشتہ عہد کے کچھ نہ کچھ اسباب نئے عہد کی طرف ضرور منتقل ہوتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے اختلاف کا نمایاں اور بنیادی سبب اسلام کے متعلق ان کی ناواقفیت و جہالت یا اس کے بارے میں ناقص علم کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

Marfat.com

اسلامی ممالک میں کافرانہ استعمار کے داخلے سے پہلے کے علمی ماحول کا ذکر تو آپ پڑھ چکے، آئندہ سطور میں ہم استعماری قوتوں کے غلبہ کے بعد ان حالات کا جائزہ پیش کریں گے جس کے نتیجے میں اس صورتِ حال میں مزید ابتری پیدا ہوئی۔ استعماری طاقتیں یہ جان چکی تھیں کہ مسلمانوں کی فضیلت و عظمت کا راز کس چیز میں پنہاں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی توجہ مسلمانوں کے نصابِ تعلیم اور ایسے اداروں کے قیام پر مرکوز کر دی جن کے ذریعے سے ان کی سوچ اور اندازِ فکر پر اثر انداز ہو کر انہیں نئی صورتِ حال اور نئے عالمی نظریات کو قبول کرنے اور ان کے مطابق ڈھل جانے کے لیے تیار کر سکیں۔

انہوں نے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی پوری کوشش کی کہ مسلمان اس نئی صورتِ حال کو قبول کر کے ترقی کی منازل طے کر سکتے ہیں جس طرح مغربی ممالک میں ہوا کہ تہذیب و تمدن کی شاہراہ پر انہوں نے اس وقت قدم رکھا جب مذہبی احکام سے بغاوت و سرکشی کی راہ اپنا کر کلیسا کی پابندیوں سے خود کو مکمل طور پر آزاد کر لیا۔ ان کے خیال میں ہر مذہب متوقع ترقی و خوشحالی کی راہ میں انسانی پیش رفت کے لیے ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا﴾ [الکہف۱۸: ۵] (بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، وہ محض جھوٹ بکتے ہیں)۔

ان کا یہ دعویٰ دیگر تحریف شدہ مذاہب کے بارے میں تو درست ہو سکتا ہے، لیکن اسلام کے بارے میں ایسا دعویٰ یقیناً غیر حقیقت پسندانہ ہے، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی سعادت و خوشحالی وابستہ کر رکھی ہے۔ انسانیت اس نورِ الٰہی کی روشنی میں اپنی ساری امیدوں اور امنگوں کی تکمیل کر سکتی ہے۔

Marfat.com

امتِ مسلمہ کا شیرازہ بکھیرنے اور اس کے اسلامی تشخص کو ختم کرنے کے لیے کافرانہ استعمار نے اسلامی تعلیم اور اس کے ذریعے تعلیم یعنی عربی زبان کے لیے طرح طرح کی مشکلات اور رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے دیگر وسائل اپنانے کے ساتھ ساتھ ان طلبہ کے ساتھ بھی بے توجہی برتی جانے لگی، جنہیں دیگر طریقوں سے اسلامی تعلیم کی راہ سے ہٹانا ان کے لیے مشکل تھا۔ ان کے بارے میں ایسے خیالات پھیلائے گئے جن سے ان کے مقام و مرتبہ کو دھچکا لگا۔ ان کی حیثیت گر گئی اور یہ علوم و فنون بے وقعت ہو کر رہ گئے۔ نتیجۃً معمولی درجے کی ملازمتوں، عہدوں اور مناصب سے بھی وہ محروم کر دیے گئے۔ اس کے مقابلے میں ایسے طلبہ پر خصوصی توجہ دی گئی جو جدید طرز کی درس گاہوں سے منسلک ہو کر وہاں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اس سلسلے میں انہیں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی گئیں اور ان کے لیے روشن مستقبل کے دروازے کھول دیے گئے۔ تاکہ امتِ مسلمہ کی قیادت و سیادت کے مناصب انہی کے لیے مخصوص ہو سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی تعلیم اور عربی زبان سیکھنے والے طلبہ کی تعداد محدود ہو کر رہ گئی۔ ان تمام مشکلات کے باوجود معدودے چند طالب علم اگر ادھر کا رخ کرتے بھی تو انہیں عام طور پر ایسی سختیوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا جس سے وہ دل برداشتہ ہو کر اول تو یہ راستہ ہی چھوڑ دیتے، لیکن اگر کوئی جرأت کر کے آگے بڑھنا بھی چاہتا، تو اس کے اور دوسروں کے درمیان مختلف عہدوں، ملازمتوں اور بڑے مناصب میں کئی قسم کے امتیازات برتے جاتے، جنہیں دیکھ کر انہیں ظلم و ناانصافی اور اپنی بے بسی کا شدید احساس ہوتا۔ یہ صورتِ حال اب تک جوں کی توں برقرار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر اسلامی ممالک میں اسلامی تعلیم

Marfat.com

کا معیار بہت گر گیا ہے۔ طالب علموں کی انتہائی قلیل تعداد اس جانب رُخ کرتی ہے، اور وہ بھی یہ جانتے ہوئے اس میدان میں اترتے ہیں کہ وہ جو کچھ کاشت کر رہے ہیں اس کا کاٹنا شاید ان کے مقدر میں نہ ہو۔ بہر حال ان تمام رکاوٹوں کے باوجود جو لوگ اس طرف آتے ہیں، تکمیلِ علوم کے بعد عملی زندگی میں انہیں پھر شاید مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چونکہ ان پر معاشرہ میں فعال کردار ادا کرنے کے تمام دروازے بند کر دیے گئے ہیں، لہٰذا وہ دعوتِ دین کا کام اور معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں بھی اپنا فرض پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ ان بند دروازوں کے سامنے ان کی پامردی اور ثابت قدمی جواب دینے اور ان کی شخصیت کمزور پڑنے لگتی ہے اور بالآخر وہ ایسے سرکاری، مذہبی اداروں سے وابستہ ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو پہلے ہی چند لگے بندھے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے قائم کیے گئے ہیں، جن سے ہٹ کر کوئی بھی کام کرنا ان کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس طرح معاشرے میں جب وہ اپنا کردار ادا نہیں کر پاتے تو عام مسلمانوں کا ان پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

امتِ مسلمہ کو اپنے عقائد سے برگشتہ کرنے اور اس کی شریعت سے وابستگی کو کمزور کرنے کے لیے کافرانہ استعمار نے عربی زبان اور اسلامی تعلیم کو ذیلی حیثیت دے کر اور اپنی پسند کے افکار و نظریات کے لیے میدان ہموار کر کے نوجوانانِ ملت کے لیے اسے بے حد پرکشش بنا دیا، مگر انہیں وہاں سے کانٹوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ملا۔ مسلمانوں کی نوجوان نسل نے کمیونزم، سوشلزم، قومیت اور اس طرح کی دیگر تحریکوں کو جنہیں ان کے سامنے خوش نما بنا کر پیش کیا گیا تھا اور جن تحریکوں اور نظریات نے امت کو پہلے سے زیادہ ذلت و رسوائی میں مبتلا کر دیا تھا، آزما لینے کے بعد بخوبی جان لیا

Marfat.com

کہ اسلام ہی اس امت کے تمام مسائل و مشکلات کا واحد حل ہے۔ صرف وہی انہیں قعرِ مذلت سے نکال سکتا اور امت کی پس ماندگی کے اسباب و وجوہات کو دور کر سکتا ہے۔ یہ بات بڑی خوش آئند تھی کہ ہمارے نوجوانوں میں مختلف راہوں میں بھٹکنے کے بعد اسلام کی طرف رخ کرنے کا شعور بیدار ہوا اور انہیں اپنے دین و ایمان اور وجود کو لاحق خطرات کا احساس ہونے لگا۔

اس سلسلے میں انہیں دینی بصیرت پیدا کرنے اور شرعی احکام و مسائل جاننے کے ضمن میں پھر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چونکہ ان کے سامنے کوئی مربوط تعلیمی نظام نہیں تھا جو اس سلسلہ میں ان کی راہنمائی کرتا، لہٰذا انہیں جو بھی کتابیں دستیاب ہو سکیں، انہوں نے بطورِ خود ان سے استفادہ کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف انہیں ایسے باصلاحیت اساتذہ بھی میسر نہ آسکے جو ان کی مناسب راہنمائی کر سکتے، چنانچہ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہ کتابیں پڑھ کر اسلام کو انہوں نے ان کتابوں کے تناظر میں دیکھا، اور اس طرح اسلام کا ایک محدود گوشہ تو ان کے سامنے آیا، مگر اسلام سے وہ کلی طور پر متعارف نہ ہو سکے اور ان کی نگاہوں سے اس کے اصول و مقاصد اوجھل رہے۔ ان کی مثال ان اندھوں کی سی ہوگئی جو کسی ہاتھی کو اپنے ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھنا چاہتے تھے۔ جس کا ہاتھ جہاں پہنچا اس نے اس حصے کو مکمل ہاتھی سمجھ لیا۔ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا معاملہ انہی اندھوں والا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اسے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق سمجھنے کے لیے کوشاں ہے۔ اس چیز نے انہیں مختلف جماعتوں اور چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ ان لوگوں کی تو بات ہی کیا جو اسلام سے منہ موڑ کر اپنی خواہشاتِ نفسانی کے گھوڑے پر سوار بگ ٹٹ دوڑے جا رہے ہیں اور جس کا رخ کبھی وہ مشرق کی

Marfat.com

طرف موڑ دیتے ہیں اور کبھی مغرب کی طرف، جبکہ اسلام سے ان کا رشتہ بس ان اسلامی ناموں کی حد تک ہے جو انہیں موروثی طور پر ملے ہیں۔ اگر ذرا سی بھی شرم وحیا باقی نہ رہ جاتی تو وہ ان سے بھی جان چھڑا لیتے۔ البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اسلام کے سایہ دار درخت کی جانب لوٹنا چاہتے ہیں؛ لیکن صحیح راہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے لیے وہ مختلف راہیں اختیار کرنے پر مجبور ہیں اور اس طرح ان میں اختلاف واقع ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ خود ان میں پھوٹ پڑتی ہے، بلکہ ان کے دشمنوں کو ان پر غلبہ حاصل کرنے میں دشواری پیش نہیں آتی اور حکمرانوں کی لاٹھی بھی ان کا ہر جگہ پیچھا کرتی رہتی ہے۔

راہِ نجات

امت جس مرض میں مبتلا ہے، اس کی تشخیص کے بعد اب ہم مندرجہ ذیل سطور میں ان کے علاج کی مختلف صورتوں کا سرسری جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ جو مخلص مسلمان میدانِ دعوت و تبلیغ میں سرگرمِ عمل ہیں اور جنہیں امت کے اس المیے سے سروکار ہے، انہیں چاہیے کہ چند ذہین و فطین مسلم نوجوانوں کے ایک گروہ کا انتخاب کر کے علومِ شریعت کی تدریس کے لیے انہیں بہتر مواقع مہیا کریں اور ایسے بچے کھچے علماے شریعت کے زیر سایہ ان کی تربیت و تعلیم کا اہتمام کریں، جو علم و عمل، مہارت و تقویٰ، صحیح فکر و نظر، اسلام کے مفاد اور اہداف کے ادراک اور علومِ اسلامیہ میں گہری بصیرت و تفقہ کے حامل ہوں اور اپنی عملی زندگی میں بھی ایک قابلِ تقلید نمونہ ہوں۔ اس تربیت و تعلیم میں نبوی طریق کار ان کے لیے مشعلِ راہ ہونا چاہیے۔ نوجوانوں کے اس گروہ کو چند ایسے دوسرے نوجوانوں کے ذریعے تقویت

Marfat.com

پہنچائی جائے جو مختلف عصری علوم کے ماہر ہوں اور جو اخلاص و تقویٰ کے مرتبے پر بھی فائز ہوں۔ دونوں طرح کے یہ نوجوان مل کر سفر کا صحیح رخ متعین کر سکتے ہیں اور اسلامی بیداری کی موجودہ لہر کی راہنمائی کر کے اسے انحراف سے بچا سکتے ہیں، جس کے بعد امت کے لیے عافیت و چھٹکارے کا سامان ہو سکے گا اور روز بروز تباہی کے گڑھے کی طرف بڑھنے والے انسانیت اس کی قیادت میں اپنا صحیح رخ متعین کر سکے گی اور ظاہر ہے کہ اس کی نجات اسلام ہی میں مضمر ہے۔

۲۔ مسلمانوں کے فکری سفر اور سوچ میں اس طرح سے تبدیلی لائی جائے کہ اس سے اس فکری بحران کا علاج ہو سکے جس سے مسلمان آج کل دوچار ہیں اور جس کے دور رس اثرات و نتائج کا شعور کم ہی لوگوں کو ہے۔ یہ بحران مسلم اداروں کے زوال و انحطاط، مسلم تنظیموں کے فقدان، مسلم نوجوانوں کے ہاں علم و آگہی اور تربیت و تعلیم کے گرتے ہوئے معیار، باہمی تعلقات میں پھوٹ آنے، اور صالح گروہوں کی قابلِ قدر کوششوں کو ناکام بنانے کی تدبیروں سے عیاں ہو جاتا ہے۔ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کو میدان زندگی سے دور کیا جا چکا ہے۔ اسلام کے مثالی افکار و نظریات اور انسانیت کے درمیان خلیج گہری ہو چکی ہے۔ اسلام کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ یہ ایک ایسا بادل ہے جو نہ تو برستا ہے اور نہ ہی مردہ زمین میں زندگی کی نئی روح پھونک سکتا ہے۔ یا پھر اس کی مثال چکنے پتھر پر پڑنے والے پانی کی ہے جو کوئی کھیتی اگاتا ہے نہ کوئی سبزہ، کیونکہ دل سخت ہو چکے ہیں، انہیں زنگ لگ چکا ہے اور آنکھیں خیرہ ہو چکی ہیں، جن کے اندر خیر و شر میں تمیز کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔

مختلف تعلیمی ادارے امت کو معتدل مسلمان انسان دینے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ مسلم ممالک میں مغربی طرز پر جو یونیورسٹیاں قائم ہیں وہ اپنی ذمہ داری یہ نہیں سمجھتیں

Marfat.com

کہ تمام شعبہ ہائے علوم میں ایسا ماہر مسلمان تیار کرنا ہے جو تمام علوم و معارف کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتا ہو، بلکہ ان کا مطمحِ نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ ایسے طلبہ تیار کیے جائیں کہ جو مغربی علوم و فنون کے دل دادہ ہوں، اور جلد ہی اسلامی عقائد اور اسلامی نقطۂ نظر سے زندگی کے مقاصد و اہداف سے قطع تعلق کر لیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان یونیورسٹیوں سے ایسی نسل نکلی جس کا امت سے تعلق و رابطہ کمزور اور متردّد اور سوچ الجھی ہوئی ہے۔ اپنے علم کو امت کی ضرورت کے لیے استعمال کرنا ان کے بس میں نہیں ہے۔

دوسری طرف وہ تعلیمی ادارے، جو شرعی و دینی مزاج رکھتے ہیں جیسے جامعہ ازہر اور اس طرح کی دیگر اسلامی جامعات یا کلیات و مدارس وغیرہ، انہوں نے محدود پیمانے پر تو چند شرعی علوم میں کچھ ماہرین پیدا کیے ہیں، لیکن یہ ادارے ایسے مستند علما پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں جو امت کی عملی اور فکری قیادت اور دین کی تجدید کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے اسلام کو اس کے اصولوں اور اہداف و مقاصد کی روشنی میں امت کے سامنے پیش کر سکیں اور موجودہ دور کے چیلنجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ان پر قابو پا سکیں۔ اس بنا پر اسلامی فکر کا دائرہ تنگ ہوتا گیا اور مسلمانوں کی زندگی اور اندازِ فکر پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی عقلیں تمام غیر اسلامی افکار و نظریات کو بھی قبول کرنے لگیں اور مسلمان سیاست، معیشت اور معاشرت وغیرہ میں اپنے مسائل حل کرنے سے عاجز رہے اور دوسروں کی الٹی سیدھی نقلیں کرنے لگے۔ فرزندانِ امت کی باہمی رسہ کشیوں نے امت کی اقدار و روایات اور اصولوں کے بندھنوں کو توڑ ڈالا۔ یہ باہمی تصادم عام طور پر مغرب سے متأثر اور اس کی

Marfat.com

ثقافت کے دل دادہ گروہ کے حق میں مفید ہوتا ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ یہ ایمانی گروہ ہراول دستہ بننے، اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے اور چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے خود ہی جھگڑوں اور اختلافی مسائل کا شکار ہو گیا، کیونکہ اکثر مسلمانوں کے ذہن میں جزئیات و کلیات اور اصول و مقاصد باہم گڈمڈ ہو گئے ہیں۔

ہمیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ کتاب و سنت کی روشنی میں اسلام کی روح، اس کے مقاصد و قواعد کلیہ اور مسائل و احکام کے درجات کے شعور و ادراک کی بنیاد پر قائم کردہ صحیح اسلامی سوچ پیدا کریں۔ قرونِ خیر میں سلفِ صالحین کتاب و سنت سے جس طرح استفادہ کرتے تھے، اس اسلوب کو سمجھنے کی ضرورت ہے، تاکہ اس کے ذریعے امت کے مسائل کو اسلام کے تصورات اور اس کے پیش کردہ حل کے مطابق نمٹا سکیں اور افرادِ امت کو اس بات کا پورا پورا یقین حاصل ہو سکے کہ اسلام ہی راہ نجات اور تمام مشکلات کا واحد حل ہے۔ یہی یقین امتِ مسلمہ کو اسلام کی فکری بنیادوں کے ساتھ شعور و بصیرت کے ساتھ اس طرح سے تعلق پختہ کرنے پر مجبور کر دے گا کہ اس کے بعد شیطان اسے کاٹ کر علیحدہ نہیں کر سکتا۔ امتِ مسلمہ جب خوابِ غفلت سے بیدار ہو گی اور مرض کی صحیح تشخیص کر لے گی تو ایسے طریقے اسے خود بخود نظر آئیں گے (اور انہیں اختیار کیے بغیر ان کے لیے کوئی چارۂ کار نہ ہو گا) جن کے ذریعے اس کے مرض کا علاج ہو سکے اور وہ اسے اپنے مقصد تک پہنچا سکیں۔ ان شاء اللہ وہ دن دور نہیں۔

Marfat.com

Marfat.com

خاتمہ

مذکورہ دونوں اہداف تک پہنچنے کے لیے، اسلامی بیداری کے ہراول ایمانی دستے کو یہ چند باتیں ذہن نشین رکھنی چاہییں، تاکہ راہ کھوٹی نہ ہوسکے۔

ا۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلم نوجوانوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ قرآن حکیم کو سمجھنا اور اس سے عبرت و نصیحت حاصل کرنا ہمارے لیے آسان فرما دیا ہے، اور بہت سی کتب احادیث کی روشنی میں سنت نبوی جاننے اور سمجھنے کی راہیں بھی ہموار کر دی ہیں لیکن ان مصادر و مآخذ سے براہِ راست اپنے طور پر خود ہی استفادہ کر کے کوئی حتمی رائے قائم کرنے میں بہت سارے خطرات ہیں۔ انہیں سمجھنے کے لیے پہلے سے استعداد اور صلاحیت کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ استنباط کے قواعد و ضوابط عربی زبان و ادب اور اس کے اسالیبِ تعبیر میں مہارت، علومِ کتاب و سنت، ناسخ و منسوخ، عام و خاص، عام جس سے خاص مراد ہو، مطلق و مقید و دیگر احوال و قیود کی صحیح پہچان بھی ضروری ہے جیسا کہ متعلقہ اہل علم نے اس کی تفصیلات بیان کر دی ہیں، اس کے بغیر کوئی مسلمان دینی و شرعی امور و مسائل میں کوئی گفتگو کرے تو وہ محض خواہش نفس کی پیروی کرتے ہوئے اٹکل پچو سے کام لے رہا ہو گا اور اس کا علم و ہدایت اور نورِ ربانی سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ ایسا طریقہ اختیار کرنے والا شخص خطرناک سواری پر چڑھ کر اپنے آپ کو ہلاک کر رہا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

Marfat.com

مَن قال في القرآن بغير علم، فليتبوّأ مقعده من النار (جو شخص علم کے بغیر قرآن کے بارے میں گفتگو کرے، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے)۔[1]

قرآن و حدیث سمجھنے کے لیے جن علوم و معارف کی ضرورت ہے، ان کا حصول محض ایک دو کتابوں سے ممکن نہیں۔ اس کے لیے اسے باضابطہ اور پختہ مطالعہ کی ضرورت ہے جس سے ایسے علوم و فنون میں اسے مہارت حاصل ہو جائے جس کے سہارے اسلامی علوم اور فکرِ اسلامی کے میدان میں وہ قدم رکھ سکے اور پھر اپنے متوقع نتائج کے لیے ہمہ گیر اور گہری تحقیق و تفحص اور دقّتِ نظر کی ضرورت ہے جس کی راہنمائی اور نگرانی کسی ایسے استاد کے ذمہ ہو جو ماہر علوم، بہترین راہنما و راہبر اور فکر و بصیرت رکھنے والا ناقد بھی ہو اور پھر یہ سارے امور اللہ تعالیٰ کی خشیت و تقویٰ کے زیرِ سایہ انجام پائیں اور ان سے مقصود صرف اللہ کی طرف سے اجر و ثواب کی امید ہو۔

۲۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ شریعت انسان کی دنیوی و اخروی فلاح کے لیے نازل فرمائی ہے اور اس کی ذہنی و فکری توانائی کے مطابق اس کے مصالح و مفادات کی تکمیل کے لیے اسے بھیجا ہے، اس نے انسان اشرف المخلوقات ہونے کا اعزاز بخشا ہے اور کوئی ایسا حکم اس نے اسے نہیں دیا جس پر وہ عمل نہ کر سکے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ [الحج ۲۲: ۷۸] (اس نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی)۔

۱۔ ترمذی نے ابن عباسؓ سے صحیح سند کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے جیسا کہ الجامع الصغیر ۲: ۳۰۹؛ الفتح الکبیر ۳: ۲۱۹ میں ہے۔ بقیہ تینوں اصحابِ سنن نے بروایتِ جندب ان الفاظ کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے: من قال في القرآن برأيه فأصاب فقد أخطأ. الفتح الکبیر ۳: ۲۱۹

Marfat.com

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس دین پر بے دلی اور جبر کے بجائے محبت اور دل کی پوری رغبت کے ساتھ عمل کیا جائے، اس لیے اس نے بندوں کے ساتھ آسانی اور نرمی کا معاملہ کیا ہے۔ اسی سلسلے میں ارشاد ہے: ﴿يُرِيدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [البقرۃ۲: ۱۸۵] (اللہ تعالیٰ تم پر آسانی چاہتا ہے وہ تم پر سختی نہیں چاہتا)، ﴿يُرِيدُ اللهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ﴾ [النساء۴: ۲۸] (اللہ تعالیٰ تم پر تخفیف کرنا چاہتا ہے)، کیونکہ وہ اپنی مخلوق کے ضعف اور ناتوانی کو سب سے زیادہ جانتا ہے ﴿وَخُلِقَ الإِنْسَانُ ضَعِيفًا﴾ [النساء۴: ۲۸] (آدمی کمزور بنایا گیا ہے)۔

شریعت کے تمام احکام میں بندوں کے مصالح اور ان کے مفادات کی تکمیل کا لحاظ رکھا گیا ہے، جن کے سارے فوائد انہیں ہی حاصل ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو نہیں؛ کیونکہ اس کی ذات ان چیزوں سے ہر طرح مستغنی اور بے نیاز ہے۔ اس لیے مقررہ اصول وکلیات کی روشنی میں شریعت کی جزئیات کو اچھی طرح سمجھنا بے حد ضروری ہے، اور جس شخص کی ان سب پر جامع نظر نہ ہو اور نہ ان کے مقاصد و قواعد کو سلیقے سے جان سکے، وہ فروع کو اصول سے اور جزئیات کو کلیات سے کس طرح مربوط کر سکتا ہے۔

ابن برہان[1] کہتے ہیں:

۱۔ ابن برہان (یا ابن ترکان)، احمد بن علی بن برہان بغدادی (م۵۱۸ھ)۔ مشہور اصولی ہیں، آپ کی کئی تصانیف ہیں جن میں الوصول إلی علم الأصول، الأوسط اور الوجیز کو شہرت حاصل ہے۔ پہلے حنبلی تھے پھر شافعی ہوگئے۔ حالاتِ زندگی کے لیے ملاحظہ ہو: ابن سبکی، طبقات الشافعیة ۴: ۴۲؛ الوفیات ۱: ۱۹۹؛ البدایة والنهایة ۱۲: ۱۹۶؛ طبقات الأشنودی ۱: ۲۰۸؛ ابن جوزی، المنتظَم ۹: ۲۵۰

Marfat.com

شرائع ایسے انتظامی امور ہیں جن سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو نظم وضبط کی راہ پر لگاتا ہے۔ ہر زمانے میں لوگوں کے الگ الگ حالات و معاملات ہوتے ہیں، اور ان کے لیے ویسی ہی تدابیر بھی ہوتی ہیں اور ان کے ساتھ کچھ مخصوص نرمی اور مصلحت بھی ہوا کرتی ہے اور ہر امت کے لیے الگ الگ تدبیریں ان کے مناسب حال ہوتی ہیں، اگرچہ وہ دوسروں کے لیے مضر اور نقصان دہ ہوں۔[1]

اس بات پر علماے امت کا اتفاق ہے کہ سارے احکام شریعت کے پیچھے مصالحِ انسانی کے اسباب وعلل پوشیدہ ہیں جس کی وجہ سے ان کی تشریع ہوئی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی معرفت ہمیں واضح طور پر یا بطریقِ اشارہ وکنایہ عطا فرمائی ہے، یا جن اسباب کو ہم نہ سمجھ سکے، ان میں بھی کوئی حکمت ہی ہے جس کا علم اللہ کو ہے۔ اسی لیے بہت سارے اجتہادی احکام حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے بدل بھی جاتے ہیں اور انسانوں کے احوال وواقعات اور ان کی صلاحیت وطاقت وغیرہ کے فرق سے بھی ان میں تبدیلیاں آجاتی ہیں۔

قرآن حکیم اور سنت واحادیثِ متواترہ کے نصوص قطعی الثبوت ہوتے ہیں۔ بعض جیسے اخبارِ آحاد ظنی الثبوت ہوتے ہیں۔ نص کی دلالت کبھی قطعی اور کبھی ظنی ہوتی ہے، جس کا جاننا ضروری ہے، کیونکہ فہم نص اور استنباط واجتہاد میں انہی کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اسی لیے جب تک نصوص شریعت سے واضح تعارض نہ ہو اور دلیل میں گنجائش اور لفظ میں جب تک احتمال باقی ہو، اس وقت تک نص سے اپنے اخذ کردہ مفہوم کے خلاف کسی دوسرے عالم کے اختیار کردہ مفہوم کا رد وانکار نہیں کیا جاسکتا۔

۱۔ الوصول إلى الأصول۔ المسألة الرابعة في مسائل النسخ (دست خطی)

Marfat.com

بہت سے فروعی اور عملی احکام کا ثبوت ظنی طریقے سے ہوا ہے جن سے بندوں پر اللہ کی رحمت کا ظہور ہوتا ہے، تاکہ لوگوں کے لیے غور و فکر اور اجتہاد کا میدان کشادہ رہے۔ جب شارع حکیم نے آسانی کا دروازہ کھول رکھا ہے اور انسانوں کے مصالح کا اعتبار اور رعایت بھی ہے تو کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مذکورہ امور میں اپنے کسی مخالف پر کفر و فسق اور بدعت و ضلالت کے القاب چسپاں کرے، بلکہ ان کے لیے کوئی مناسب عذر سامنے رکھنا چاہیے، جس سے رشتۂ محبت قائم رہے، جس کے نتیجے میں وہ بھی محبت و احترام پاسکے اور باہمی اخوت و مودّت کا ہر وقت پاس ولحاظ رہے۔

۳۔ اسلامی اخوت و اتحاد اور یگانگت کا تحفظ اور اس کو ضعف اور نقصان پہنچانے والی چیزوں کو راستے سے ہٹانا مسلمانوں کا سب سے عظیم اور اہم فریضہ اور سب سے اہم عبادت و اطاعتِ خداوندی ہے، کیونکہ اسی اخوت کے ذریعے ہم ان ساری مشکلات پر قابو پاسکتے ہیں جو اسلامی نشأۃِ ثانیہ کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے تفرقہ اندازی کو سخت ناپسند فرماتے ہوئے اس سے دور رہنے کی تلقین فرمائی ہے اور جماعتِ مسلمین کے درمیان نفاق و افتراق پیدا کرنے والے کا خون مباح ٹھہرایا ہے۔ اسی لیے محض اختلافِ رائے کی وجہ سے اسلامی اخوت میں رخنہ ڈالنا یا اسے نقصان پہنچانا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ بالخصوص موجودہ حالات میں جبکہ ساری اقوام ہمارے خلاف صف آرا ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ ایمان کی چنگاری جو بھڑکنا چاہتی ہے، اسے بجھادیں، اور وہ مبارک بیج جو مخالفین کی ریشہ دوانیوں کے باوجود زمین کا سینہ چیر کر باہر آنے اور برگ و بار لانے کو ہے، اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

Marfat.com

اخوت و اتحاد اور مسلمانوں سے محبت کو تمام فرائض میں اولیت کا درجہ حاصل ہے، کیونکہ توحید سے اس کا قریبی تعلق ہے۔ اسی طرح اخوتِ اسلامی کے خلاف کوئی قدم اٹھانا بھی ممنوعات و منکرات میں سرِفہرست ہے۔ اسی لیے علماے سلف اختلاف سے بچنے اور مسلمانوں کے باہمی ربط و تعلق کے خیال سے افضل کو چھوڑ کر مفضول پر عمل کر لیتے تھے اور کبھی کبھی اپنے نزدیک جو امر مندوب و مستحب ہوتا، اسے چھوڑ کر مباح ہی پر اکتفا کر لیتے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کہتے ہیں:

ایک دوسرے کی اقتدا میں نماز پڑھنے پر مسلمانوں کا اتفاق ہے، جس طرح صحابہ و تابعین کرام اور ان کے بعد ائمۂ اربعہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ اس کا منکر بدعتی، گمراہ اور کتاب و سنت اور اجماع امت کا مخالف ہے۔ صحابہ و تابعین اور ان کے بعد مسلمان (نماز میں) بسم اللہ پڑھتے بھی تھے اور نہیں بھی پڑھتے تھے، اس کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے۔ جیسے امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اور (امام) شافعی وغیرہ مالکی ائمۂ مدینہ کی اقتدا میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے اگرچہ وہ زور سے یا آہستہ بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔ (امام) ابو یوسف نے ہارون الرشید کے پیچھے نماز پڑھی جس نے پچھنے لگوا رکھے تھے، (امام) مالک نے اس سے وضو واجب نہ ہونے کا فتویٰ دیا ہے تو اس کے پیچھے ابو یوسف نے نماز پڑھ لی اور اس کا اعادہ نہیں کیا۔ امام احمد کے یہاں نکسیر پھوٹنے اور پچھنے لگوانے سے وضو واجب ہو جاتا ہے، ان سے کسی نے پوچھا: اگر امام کے جسم سے خون نکل آئے اور وہ وضو نہ کرے تو کیا میں اس کے پیچھے نماز پڑھ سکتا

Marfat.com

ہوں؟ آپ نے کہا: سعید بن مسیّب اور مالک کے پیچھے تم نماز کیسے نہیں پڑھو گے؟[1]

اسلامی اخوت اور اتحاد مسلمین پر زور دینے سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ بنیادی عقائد جن میں قواعدِ مسلمہ کے حدود میں تاویل کی کوئی گنجائش نہ ہو، ان میں بھی سستی اور تغافل برتا جاسکتا ہے۔ اَعدائے امت سے مقابلے کا یہ مطلب نہیں کہ اخوتِ اسلامی کی دلیل سے ہم اپنا ہاتھ ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دیں جو صرف نام نہاد مسلمان ہیں۔ اختلافی مسائل جن سے باہمی انتشار و افتراق نہیں ہونا چاہیے، بس وہی ہیں جنہیں ائمہ سلف نے مانا ہے، اور جو ان کے حدودِ آداب میں داخل رہے، اور مختلف طریقوں سے عمل کے ان کے پاس دلائل تھے۔

۴۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بہت سی عبادتوں کی ادائگی کے تین درجے مقرر فرمائے ہیں: افضل، اختیار اور جائز، اور یہ سارے درجے اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہیں، لیکن ان کے درجے مختلف ہیں، بہت سے فرائض و واجبات کی متعدد صورتیں مذکورہ اقسام میں داخل ہیں جنہیں ان کی متعین افضل شرعی شکل میں ادا کیا جائے تو زیادہ اجر وثواب کے ساتھ ان کی قبولیت کی امید کی جاتی ہے، مثلاً کوئی شخص اول وقت میں تمام سنتوں اور آداب کے مطابق نماز باجماعت ادا کرے۔ اس سے کم درجہ "اختیار" کا ہے یعنی متعلقہ فریضہ غیر افضل انداز سے انجام دینا۔ جیسے کوئی شخص نماز پڑھے مگر اول وقت میں اسے نہ ادا کرے، بلکہ اس میں کچھ تاخیر کردے۔ تیسرا درجہ جواز کا ہے جس میں اگر وہ کچھ اور تنگی کردے تو اس کا شمار نماز سے کوتاہی کرنے والوں میں ہو جائے۔

۱۔ شیخ منقور، احمد بن محمد التمیمی، الفواکه العدیدة في المسائل المفیدة (المکتب الاسلامی بیروت، ۱۹۶۰ء) ۲: ۱۸۱

Marfat.com

قولِ مأثور ہے کہ اچھے لوگوں کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں (حسنات الأبرار سیّئات المقرّبین)۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اپنے حالات و معاملات کے فرق کے باوجود تمام لوگ اسلام کی سب سے اعلیٰ اور مثالی صورت پر ہی عمل کریں تو اس خواہش کی تکمیل ممکن نہیں۔ اگر اطاعت وعبادت کے درجوں میں فرق نہ ہوتا تو جنت میں مسلمانوں کے درجات میں بھی فرق نہ ہوتا۔ انسانوں کی استعداد، صلاحیتیں اور طاقتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور جس کے اندر جیسی استعداد ہے، اسی کے مطابق وہ عمل کرتا ہے۔

ابن جریر طبری[1] اپنی تفسیر میں یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ کچھ لوگ مصر میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ملے اور ان سے کہا، بہت سی چیزیں ہم دیکھ رہے ہیں جنہیں کرنے کا حکم دیا گیا ہے مگر ان پر عمل نہیں ہو رہا۔ اس لیے ہم اس سلسلے میں امیر المومنین سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابن عمرؓ اور وہ تمام لوگ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملے۔ سیدنا عمرؓ نے عبداللہ سے پوچھا: کب آئے؟ انہوں نے کہا: فلاں وقت۔ آپ نے پھر پوچھا: اجازت لے کر آئے ہو؟ حسن راوی کہتے ہیں مجھے یاد نہیں انہوں نے کیا جواب دیا۔ پھر ابن عمر نے کہا: امیر المومنین، کچھ لوگ مصر میں مجھ سے ملے اور کہا کہ اللہ کی کتاب میں کچھ ایسے احکام ہیں جنہیں کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ان پر عمل نہیں کیا جارہا۔ اس لیے انہوں نے اس سلسلے میں آپ سے ملنا چاہا۔ آپ نے ان سے فرمایا: ان سب کو بلا لاؤ۔ چنانچہ میں نے انہیں اکٹھا کر دیا۔ اب آپ نے سب سے چھوٹے آدمی سے کہنا شروع کیا: میں اسلام کے واسطہ

۱۔ تفسیر طبری ۵: ۲۹

Marfat.com

سے تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ تم نے پورا قرآن پڑھا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ کیا تم نے اپنے طور پر اسے پورا کر لیا ہے (یعنی پورے قرآن پر عمل کر لیا ہے)؟ اس نے کہا: نہیں۔ (اگر وہ ہاں کر دیتا تو حضرت عمرؓ اسے لاجواب کر دیتے) پھر فرمایا: کیا تم نے اسے اپنی نگاہ، اپنے الفاظ / زبان اور اپنی چال حلت (رہن سہن) میں پورا کر لیا ہے؟ اس طرح ہر ایک سے آپ پوچھتے گئے اور کہا: عمر کو اس کی ماں کھوئے! کیا تم اس پر ایسا بار ڈالنا چاہتے ہو کہ وہ ہر ایک کو کتاب اللہ کا عامل بنا دے؟ ہمارا رب خوب جانتا ہے کہ ہم انسانوں سے غلطیاں ہوں گی اور پھر آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی: ﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلا كَرِيمًا﴾ [النساء۴: ۳۱] (اگر تم کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو جن سے تمہیں روکا گیا ہے تو ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے اور تمہیں عزت و شرافت کی جگہ داخل کریں گے)۔

پھر پوچھا کیا اہل مدینہ جانتے ہیں، یا یہ فرمایا کہ کیا اس سلسلے میں تمہاری آمد کا اہل مدینہ کو علم ہے؟ ان سب نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: اگر وہ جان جاتے تو تمہارے ذریعے میں انہیں نصیحت کرتا۔ یعنی آپ انہیں سزا دیتے تاکہ دوسروں کو ان کے ذریعے عبرت و نصیحت ہو۔

اس واقعے میں سیدنا عمر فاروقؓ نے ہمیں واضح درس دیا ہے کہ افضل صورت وہی ہے جو مسلمانوں کے لیے قرآن کریم نے پیش کی ہے اور اسی مثالی صورت پر حتی الامکان ہر مسلمان کو عمل کرنا چاہیے، لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اسے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اللہ کی رحمت بڑی وسیع ہے اور اگر وہ کبائر سے بچتا رہے تو ان شاء اللہ اسے بھی بھلائی کا بہت حصہ مل سکتا ہے، لیکن اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہونی چاہیے کہ افضل صورت پر کاربند اور اس کا پابند ہو سکے اور ادنیٰ درجے پر قانع ہو کر وہیں نہ پڑا رہ جائے۔

Marfat.com

۵۔ موجودہ دور میں اسباب اختلاف کم کرنے اور اس کے آداب سے مزین ہونے اور ان پر مضبوطی سے قائم رہنے میں یہ چیز بہت معاون ہو سکتی ہے کہ فقہا و اسلاف کرام کے اسبابِ اختلاف کا صحیح علم و معرفت حاصل ہو جائے، کیونکہ ان کے اختلافات معقول بنیادوں پر ہوا کرتے تھے اور وہ حضرات اہلِ اجتہاد تھے۔ جن کا ہر فرد طلبِ حق کی راہ میں گم شدہ حکمت کا جویا ہوتا اور اس کے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ گم شدہ حکمت اس کے ذریعے یا اس کے کسی بھائی کے ذریعے ثابت یا ظاہر ہو رہی ہے۔

۶۔ آدابِ اختلاف پر ثابت قدمی سے کار بند رہنے میں یہ بات بھی مفید ہو سکتی ہے کہ مسلمان ان تباہ کن خطرات، ہولناک چیلنجوں اور سازشی منصوبوں سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں جو اعدائے اسلام نے دعوتِ دین کے علم بردار مسلم نوجوانوں کے لیے تیار کر رکھے ہیں۔ دشمنانِ اسلام کو اس سے غرض نہیں کہ کون سی جماعت یہ کام کر رہی ہے، بلکہ مسلک اور نقطۂ نظر سے قطع نظر وہ ہر داعیِ اسلام کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ان امور و خیالات سے واقفیت کے بعد بھی مسلمانوں میں اختلاف کی آگ بھڑکانا یا اس کے اسباب کو بڑھاوا دینا، امت کے اہداف و مقاصد کے ساتھ بہت بڑی خیانت اور ایسا عظیم جرم ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا اور نہ کسی صورت میں اس بارے میں کوئی عذر قابل قبول ہو سکتا ہے۔

۷۔ اول و آخر سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ دل میں ظاہری و باطنی ہر طرح اللہ کی خشیت و تقویٰ ہونا چاہیے۔ اتفاق ہو یا اختلاف، ہر حالت میں بندہ اس کی خوشنودی کا طلب گار رہے۔ دینی بصیرت و تفقہ، نفسانیت سے اجتناب اور شیطانی وسوسوں سے

Marfat.com

ہمیشہ دور رہنے کے لیے کوشاں اور ابلیس کی راہوں اور چالوں سے باخبر رہ کر اس کے جال میں پھنسنے سے بچتا رہے۔

اس امت کے ساتھ جو حادثات ہوئے ہیں وہی بہت ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ راہِ راست پر آکر کتابِ الٰہی سے روشنی حاصل کی جائے اور سنت رسول ﷺ پر مضبوطی کے ساتھ عمل پیرا ہوا جائے۔ شاید اللہ تبارک وتعالیٰ موجودہ نسل کے نیکوکار فرزندوں کے ذریعے امت مسلمہ کو مشکلات و مصائب سے نجات بخش دے۔ بشرطیکہ اس شبِ درماندگی اور بے راہ روی میں طویل مدت تک سرگرداں رہنے کے بعد اللہ کی راہ میں بندہ اخلاصِ نیت کے ساتھ کام کرے اور ایسے مناسب راستے اختیار کرے جو اس کے کاروانِ دعوت کو ساحلِ امن وسلامتی تک پہنچانے کے ضامن ہوں۔

صالحینِ امت کو چاہیے کہ داعیانِ حق و ایمان کو ہدایت و اعتدال پر رہنے اور توفیق خیر کی دعائیں دیتے رہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں علمِ نافع عطا فرمائے، جو علم اس نے عطا کیا ہے، اس سے ہمیں فائدہ پہنچائے اور اس میں اضافہ فرماتا رہے۔ حق بات پر ہم سب کو متحد و متفق رکھے۔ ہمیں اپنے تمام معاملات میں رشد وہدایت مرحمت فرمائے، برائیوں اور لغزشوں سے ہماری حفاظت فرمائے اور استحکام نصیب ہو جانے کے بعد ہمارا شیرازہ بکھرنے نہ دے۔ حق سبحانہ وتعالیٰ ایسا فضل کرم فرما سکتا ہے اور وہی اس پر قادر ہے۔

﴿وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين﴾

Marfat.com